حصّہ اوّل

از

مصوّرِ غم حضرت علاّمہ راشد الخیری علیہ رحمۃ

پہلا ایڈیشن

قیمت .... ~~دو روپے~~

REVISED PRICE
3/2 ----------

پبلشر

پیام مشرق بکڈپو۔ جامع مسجد۔ دہلی

(اعلیٰ پرنٹنگ پریس دہلی)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نسیمہ کی رحلت معمولی موت نہیں، ایک قیامت تھی جس نے شہر بھر میں کہرام مچا دیا۔ اُس کا دم مجموعۂ کرم تھا۔ اُس کی ہستی بے کسوں کی بستی تھی۔ اُس کا سایہ زخمی دلوں کا پھایہ تھا۔ خبرِ موت جس نے سُنی جس حال میں سُنی، اور جہاں سُنی ہائے کر کے رہ گیا۔ عورتوں کا ہجوم دو پہر تک اتنا تھا کہ تِل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ خلقت اُس میت پر پروانوں کی طرح گری۔ یتیموں نے سر پھوڑے۔ رانڈوں نے پچھاڑیں کھائیں، مظلوم قربان اور لاچار نثار ہوئے تسنیم ٹکٹکی باندھے ماں کا جنازہ دیکھ رہی تھی۔ کلیجہ پر گھونسے مارتی تھی۔ مگر آنسو نہ نکلتا تھا۔ دفعتاً کچھ خیال آیا، ایک چیخ ماری اور یہ کہتی ہوئی اُٹھی۔

"یتیموں کی ماں! تسنیم کو یتیم نہ کر۔"

قدموں میں گری، پاؤں چومے۔ اور پھر خاموش کھڑی ہو گئی۔ ڈولی پر ڈولی اُتر اور برقع پر برقع آ رہا تھا کہ سنجیدہ کی آمد کا غلغلہ ہوا۔ سو برس سے اوپر عمر، حواس درست نہ عقل ٹھکانے۔ چلنے کے قابل نہ پھرنے کے لائق قسیم گود میں اُتار لایا اور زندہ پھوپی کو مردہ بھتیجی کے پہلو میں بٹھایا۔

سنجیدہ صبر سے کام لیتی اُتری اور شکر کو ساتھ لیتی بیٹھی بے حواس تھی۔ مگر ضبط پاس تھا عقل زائل، خود گھائل۔ دِل قاش قاش۔ کلیجہ پاش پاش۔ لیکن سنبھلی ہوئی۔ دل کا حال جو کچھ تھا، اندر جیسی کچھ گذر رہی تھی، مگر زبان اور آنکھیں دونوں خاموش۔ گو وقت نے دماغ کو جس بے کش مکش جبات کی پیچیدہ سے پیچیدہ

گتھیاں دن رات سلجھائیں، قریب قریب بے کار کر دیا۔ مگر ضرورت کے لحاظ سے مصلحت کے اعتبار سے، لب پر اُف اور زبان پر آہ نہ تھی۔ اِدھر اُدھر دیکھ کر نظر اس شے پر پڑی، جو نسیمہ کا جسد خاکی تھا۔ ہاتھوں نے جس جسم کو راتوں مامتا کے جوش میں ٹٹولا، اُس کو نگاہ نے سر سے پاؤں تک پرکھا۔ اور دل نے بے ساختہ صدا دی، کہ مینا اُڑ گئی، پنجرہ موجود ہے۔ بلبل خوش الحان چل دی اور قفس خاکی رہ گیا۔ اس جسم کو بڑی بڑی امیدوں، ارمانوں اور آرزوؤں سے پالا پوسا تھا۔ آج وہ تمام اُمنگیں ختم ہوئیں۔ اِس وقت آنکھ کے سامنے دوسرا منظر تھا۔ دماغ نے انتہائی اضطراب میں وہ سماں دکھایا کہ دو برس کی جان پھوپی کے کلیجہ سے چمٹی پڑی ہے۔ گھر میں حصہ آیا۔ مچلی تڑپی، مگر ایک بھورا تک نصیب نہ ہوا۔ تھپنیاں کھاتی سو گئی۔ اس خیال کے آتے ہی جب یہ یقین ہوا کہ اب تربیت اور احتیاط ختم ہوئی تو بیتاب ہو کر ہاتھ بڑھایا۔ منہ سے کپڑا اٹھا کر دیکھا، تو کلیجہ کا ٹکڑا خاموش پڑا تھا۔ جھکی اُس کے مُنہ پر مُنہ رکھا۔ ہٹی۔ پھر صورت دیکھی۔ ٹھٹکی۔ پاس آئی۔ اُس کے مُنہ پر ہاتھ پھیرا اور صبر کیا۔

" اِس چاند سے چہرے کو۔ اس پھول سے جسم کو مارنے والی معافی کی خواستگار ہے۔ مارا ہے، پیٹا ہے، ڈانٹا ہے، ڈپٹا ہے، مگر تربیت کا تقاضا، اور پرورش کی ضرورت تھی۔ میری سختی عداوت نہیں شفقت اور زیادتی نہیں محبت تھی۔ پھر بھی تیرے بچوں کے سامنے۔ تیرے شوہر کے روبرو التجا کرتی ہوں، اے نسیمہ! مجھے معاف کیجیو! "

اتنا کہہ کر سنجیدہ نے سامنے دیکھا اور تسنیم سے کہا۔

" ہاں بی بی کپڑے تیار کرو۔ دُولہا کے واسطے دُلہن بنانے والے ہاتھ آج قبر کے واسطے دُلہن بنائیں گے۔ عطر لگانے والی میں تھی، کافور ملنے والی بھی

میں ہوں گی۔ لاؤ میری بینا کا جوڑا دو۔ چوتھی کے جوڑے میں میں شریک تھی، کفن میں بھی اپنے ہاتھ سے ایک ٹانکا لگا دوں۔"

اب سنجیدہ دیوانہ وار بھتیجی سے لپٹی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ٹانگیں انتہائی جوش میں پورا کام کر رہی تھیں۔ نہلانے والی عورت پانی اور سامان لئے بیٹھی تھی اُسے دیکھا اور کہا:۔

"بی بی! ابھی نسیمہ کی نہلانے والی موجود ہے زندہ کی نہلانے والی میں تھی مُردہ کو غسل بھی میں ہی دوں گی۔ میں نے اس جسم کی مدتوں سیوا کی۔ میں نے اس نام کی برسوں تسبیح رٹی۔ یہ بیج میرے سامنے پھلا پھولا مرجھایا۔ یہ کلی میرے ہاتھوں میں کھلی، مہکی اور اُجڑی! نسیمہ میری گود میں کھیلی، بڑھی اور مری۔ یہ تم کو مُردہ مگر مجھ کو زندہ ہے۔ تمہارے ہاتھ سخت ہیں۔ تمہارا پانی تیز ہے۔ تمہاری روئی گرم ہے۔ ایسا نہ ہو۔ میری بچی کو اذیت ہو۔

لاؤ لوٹے بھر بھر کے دو۔ وداع عارضی میں ماں نے مدد دی۔ وداع حقیقی میں آ نسیم میرا ہاتھ بٹا۔"

تہذیبِ جدید نے اس قوم کے کان میں جو میدانِ ترقی میں سرپٹ دوڑ رہی ہے اور جس کا نام مسلمان ہے، یہ بھی پھونک دیا ہے کہ انسانی تعلقات صرف زندگی کے ساتھ ہیں۔ اور جب اُمیدِ حیات منقطع ہوئی تو واسطہ غلط اور تعلق فضول اس ابتدا کی انتہا، اس آغاز کا انجام اور تہذیب کا نتیجہ ہے کہ مسلمان غسل اور کندھا خلاف تہذیب اور کسرِ شان سمجھنے لگے۔ سنجیدہ ندامت کی دلدادہ مردہ نہلانے والی پر کیوں چھوڑتی۔ مُردے کو زندوں کی طرح نہلایا اور زرق برق کپڑے پہنانے والے ہاتھوں سے کفن پہنا خاموش بیٹھ گئی۔

باہر سے آواز آئی۔ "پردہ کر لو۔ اندر آتے ہیں"۔

اب سنجیدہ اُٹھی قسیم کو پاس بلا کر کہا ۔

"خدا بچّوں کی عمر دراز کرے ۔ مگر میرا تمہارا رشتہ کل رات کو اس بیگم کی موت ختم کر گئی ۔ اب میرا تم پر کوئی حق اور زور نہیں ۔ میری بچّی کے پچھلے حقوق اِس وقت بدنصیب ماں کی تم سے سفارش کریں گے ۔ اور مجھے امید ہے کہ میری التجا بیکار نہ جائے گی ۔

مرنے والی نسیمہ جو پالکی میں بیٹھ تمہارے ساتھ میری چوکھٹ سے وداع ہوئی ، جس نے دستورِ دُنیا کے موافق مجھ کو رُلایا اور تم کو ہنسایا ۔ اور جس کا جنازہ اِس وقت میری اور تمہاری دونوں کی نگاہ کے سامنے ہے ۔ تمہاری بیوی نہیں لونڈی ، اور بیگم نہیں کنیز تھی ۔ دودھ کے دانت میری گود میں نکلے اور جوانی کے تمہارے گھر میں ٹوٹے ۔ چٹیا گندھنے کے قابل میرے ہاں ، اور سیاہی سفیدی سے تمہارے گھر میں بدلی ۔ بچپن میری چوکھٹ پر ختم اور جوانی تمہاری دہلیز پر پوری ہوئی ۔ میں جانتی ہوں مزاج کی کڑوی اور تیہے کی تیز تھی ۔ بیسیوں مرتبہ تمہارے حکم کی تعمیل میں انکار اور اپنی ناجائز ضد پہ اصرار کیا ہوگا ۔ مگر اب وہ باتیں ختم ہوئیں ۔ اور زمانہ گذر گیا ۔ اب یہ وقت ہے کہ خدمت گار نسیمہ تمہارے گھر سے وداع ہوتی ہے ۔ آج اِس کی بھلائی بُرائی ، اس کی دوزخ جنّت ، اِس کا عذاب ثواب تمہاری ذات پر منحصر ہے ۔ اپنے بچّوں کا صدقہ میری بچّی کی خطائیں معاف کرنا ۔ ناشاد نامراد بدنصیب و کم بخت جھونپڑی میں تھی ۔ جس کو یہ وقت دیکھنا پڑا ۔ خوش نصیب و بامراد ، کامیاب و مبارک تھی مرنے والی کہ تمہارے ہاتھوں زمین کا پیوند ہوتی ہے ۔ پالکی آئی اور چارپائی چلی !

یہ درخواست میرے پاس امانت ہے اور میرے اُس خط کا جواب ہے جو میں نے پلول میں لکھا "

یہ کہہ کر سنجیدہ نے نسیمہ کا خط نکالا۔ اور قسیم سے کہا

"آسمان کی طرف منہ کرو اور سچے دل سے اُس کے قصور معاف کر کے جنازہ اُٹھاؤ۔"

قسیم مرد تھا اور سنجیدہ سے زیادہ ضابط اور سنجیدہ، مگر ساس کی التجا نے کلیجے کے ٹکڑے اُڑا دیئے۔ بے قرار ہو ہی رہا تھا اُس وقت پلوں کی تصویر آنکھ کے سامنے پھر گئی اور تمام باتیں جو وہاں ہوئی تھیں ایک ایک کر کے یاد آ گئیں نسیمہ کی موت۔ ماں کا صبر۔ اپنی بے دردی۔ بلبلا اُٹھا اور یہ کہہ کر ساس کے قدموں پر گرا۔

"مرنے والی نسیمہ دکھا گئی کہ شریفوں کی بیٹیاں ناموں کی لونڈی اور کاموں کی بیگم ہیں۔ زندگی اِس کے نام سے۔ خوشی اِس کے دم سے اور گھر اِس کے بھرم سے تھا۔ عزت کا راز اِس کی ہستی میں اور ترقی کا بھید اُس کی شرافت میں پنہاں اور پوشیدہ رہا۔ خوش نصیب تھی یہ بیوی کہ اپنا جلوہ دکھا کر مجھے بتا گئی کہ مسلمان بیوی کیا معنی رکھتی ہے۔ روؤں گا آج کیا عمر بھر۔ آنکھیں ڈھونڈیں گی۔ اب کیا مدت العمر، لیکن نسیمہ وہ عورت تھی کہ میں کیا اور چھوٹے بڑے بچے کیا۔ میرا محلہ، میرا خاندان، میرا شہر اس کو ہمیشہ ہمیشہ روئے گا۔ قصور وار میں ہوں، خطائیں مجھ سے ہوئیں، غلطیاں میں نے کیں۔ بچھڑوں کو ملانے والا جامع المتفرقین میرے الفاظ کا شاہد ہے کہ میں آپ کی بچی سے نادم ہوں اور اب صرف یہ آرزو ہے کہ موت یہ صورت پھر دکھائے۔"

جنازہ اُٹھا۔ توشے وغیرہ کی رسم جس کو پڑھے لکھے مسلمان بھی ضروری سمجھ رہے ہیں۔ سنجیدہ نے قطعاً اُڑا دی۔ میت کے آنکھ سے اوجھل ہوتے ہی اُس نے کلام اللہ پڑھنا شروع کیا۔ اور جب یہ سُنا کہ آنکھ کی پتلی پیوندِ زمین

کر دی گئی تو سجدے میں گر ی. گڑگڑائی اور مغفرت کے لئے دعا مانگی.

جسدِ خاکی کا پیشِ نظر رہنا تھوڑی دیر کا منظر تھا. جب نسیمہ ہزاروں من مٹی کے نیچے جا چھپی تو ایک دو یا دس بیس نہیں سینکڑوں بندگانِ خدا روتے پیٹتے اپنے اپنے گھر رخصت ہوئے. اب نسیمہ اس دنیا میں نہ تھی. مگر اس کا نام زندہ اور اس کے کام باقی تھے.

دفن کے بعد قسیم گھر لوٹا. اس کی حالت عجیب تھی. چاروں طرف نظر دوڑاتا اور کہتا "کدھر ڈھونڈوں، کہاں دیکھوں" اسی خیال میں مستغرق گھر میں داخل ہوا تو سب سے پہلے اس کے بیٹھنے کا کونہ سونا نظر آیا. جا نماز تھی. پلنگ تھا مگر بیٹھنے والی نہیں. دونوں کاٹنے کو دوڑے، بڑھا اور سنجیدہ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر چیخیں مارنے لگا. سنجیدہ اس وقت آنکھیں بند کئے خاموش تھی. پانی منگوایا، پلوایا اور کہا.

"میں مسلمان ہوں گھائل یا جاہل جیسی بھی ہی. مگر میرا عقیدہ یہ ہے کہ عورت کی مغفرت کا بڑا حصہ شوہر کے ہاتھ ہے، زندگی شروع ہو کر ختم ہوئی. آفتاب طلوع ہو کر غروب ہو چکا. اب اندھیری رات ہے. تمہارے گھر کی رونق تمہاری زندگی کی شریک، تمہاری عمر کی رفیق، میری پیاری بچی، میری آنکھوں کا نور، میرے دل کا سرور اس وقت جنگل بیابان میں تنہا پڑی سوتی ہے. گھر کی چہل پہل جنگل کے سناٹے سے نرم و گرم بچھونے درخت کے پتوں سے، نواڑی پلنگ قبر کے گڑھے سے اور سفید چادر مٹی کے ڈھیر اور خاک کے انبار سے بدل گئی. ایک ہُو کا میدان ہے جہاں اعمال و افعال کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں. ہاں تمہاری عنایت اس کی قبر گلزار اور اس کا بیڑا پار کر سکتی ہے. رونا بے سود اور رنج بے کار ہے. قسیم اگر اس کی محبت سچی تھی تو محبت کا ہاتھ اس کی طرف بڑھا. وہ جس طرح زندگی میں تیری

دستِ نگر تھی، آج بھی تیرے کرم کی محتاج ہے۔ گر اور کہہ۔

تُو اے وہ تُو جس کی حکومت کو فنا اور جس کی طاقت کو کبھی نہ زوال نہیں۔ تُو وہ جس کی سلطنت سچی، جس کا فیصلہ حقیقی جس کا قانون اٹل، تصدّق اپنے اس پیارے کا جس کی بیویاں ہماری مائیں، طفیل اُس کے ارشاد کا جس نے بیوی کی مغفرت شوہر کی رضامندی میں دکھائی۔ میری گنہگار بیوی کو جوارِ رحمت میں جگہ دے۔"

قسیم جہاں تک غور کرتا تھا۔ تمام عمر میں کوئی دِن اور کسی دن کا کوئی واقعہ ایسا نہ تھا، کہ وہ بیوی کی شکایت کر سکے۔ اس کے غصہ کو ہمیشہ سر پر رکھا۔ اس کی خفگی سدا آنکھوں سے لگائی۔ حد یہ ہے کہ مرض الموت میں بھی اپنے پاس انگیٹھی رکھ کر اُس کا ناشتہ اپنے ہاتھ سے گرم کیا۔ نوکر چاکر گھر میں موجود تھے۔ مگر گرمی کے دنوں میں جب وہ کچہری سے آتا تو اپنے ہاتھ سے کھڑے ہو کر پنکھا جھلتی۔ بچوں والی ہوئی۔ پوتا پوتی آگے کھیلے لیکن اس طنطنے میں فرق نہ آنے دیا۔ ڈاڑھیں مار مار کر رو رہا تھا سنجیدہ نے روشنی اپنے پاس منگا کر خط نکالا کہا:۔

"میرا پہلا خط تم پڑھ چکے یہ اس کا جواب ہے اس کو بھی سُن لو تاکہ معلوم ہو جائے کہ میں کیوں مُصر ہوں۔" اس کے بعد سنجیدہ نے خط پڑھا تو یہ تھا۔

پھوپی جان کی خدمت میں فرمانبردار کنیز کی طرف سے دست بستہ آداب۔

آپ کا خط پہنچا۔ سر پر رکھا۔ آنکھوں سے لگایا۔ ہر سطر کلیجہ کے پار اور ہر حرف پتھر کی لکیر تھا۔ شفقت کی تصویر محبت کی تقریر نے کلیجہ دہلا دیا۔ کچھ شک نہیں کہ زندگی کے تعلقات فانی اور معاملات عارضی ہیں۔ حکومت اور مسرت حیاتِ انسانی کے مہمان ہیں۔ آئے ٹھہرے اور چلے گئے۔ حقیقی فرحت اور اصلی مصیبت، مالک کی رضامندی اور اس کا عذاب ہے۔ مگر پھوپی جان! کیا کروں۔ انسان ہوں۔ مامتا نے جان پر بنا دی کرنی کچھ ہوں

ہوتا کچھ ہے، کہتی کچھ ہوں نکلتا کچھ ہے۔ صبر کی کوشش جہاں تک ممکن ہے کرتی ہوں۔ گو اس دل نے پریشان کر دیا۔ تین برس کی جان بچہ نہیں چھلاوہ تھا۔ میری صورت کا عاشق، میرے نام کا دیوانہ مرتے مرتے گردن سے ہاتھ نہ نکالے۔ جانتی ہوں کہ آرزوئے موت جائز نہیں۔ مگر کہتی ہوں کہ نسیم جیسا لال جنگل میں جا سوئے اور ماں زندہ رہے۔ بھلاتی ہوں نہیں بھولتا۔ کس طرح بھولوں۔ ننھی سی جوتی، ذرا سی ٹوپی اتنی سی لکڑی، یہ چیزیں رہ گئیں اور چیزوں والا نہ رہا! گھر کا کونہ کونہ اس کی یاد تازہ۔ اور خیال زندہ کر رہا ہے۔ کہتی ہوں ادھر سے نکلا، اُدھر سے آواز آئی۔ آئے گا چمٹے گا۔ روئے گا۔ مچلے گا۔ کوٹھری میں دیکھتی ہوں۔ مگر وہ صورت نظر نہیں آتی۔ جمعرات تک اچھا خاصا کھیلتا ماتا پھر رہا تھا۔ میں نے ظہر کی نماز پڑھی۔ میرے برابر بیٹھ کر سجدے کئے۔ چیخ چیخ کر اللہ اکبر کہا۔ میں نے گود میں لیا۔ پیار کیا چمٹ گیا۔ اور کہنے لگا۔ " اماں ہمیں پان نہیں دیا بھول گئیں۔ " ہائے پھوپی اماں موت میرا لال توڑ گئی۔ اور اُس کی یاد میرا کلیجہ توڑ رہی ہے۔ میں اس دکھ سے بے خبر۔ درد سے ناآشنا اور مرض سے لاعلم تھی۔ اب معلوم ہوا کہ بندے اور خدا کا واسطہ خالق و مخلوق کا تعلق اسی پر کھلتا ہے۔ دُعا کیجئے کہ خدا میرے دل کو صبر میری زبان کو شکر اور مجھ کو تقویت دے۔ میں اُس کے حکم پر حاضر اور اُس کے فیصلہ پر راضی ہوں۔ امانت تھی لے لی۔ میں دخل دینے والی کون؟

رہا اُن کا معاملہ، وہ میرے سرتاج ہیں۔ میری اور اُن کی برابری

کیا اور لڑائی کیوں، وہ مرد ہیں عورت، وہ حاکم اور ہیں محکوم، وہ شوہر ہیں بیوی مطمئن رہیئے ماں کے دودھ اور آپ کی گود پر حرف نہ آئے گا۔ میری انسانیت اور آپ کی تربیت بدنام نہ ہوگی۔ گڑھ جاؤنگی زمین کا پیوند ہوجاؤں گی مگر سادات کے خون اور باپ دادا کی آن میں فرق نہ آنے دوں گی۔ نفرت محبت سے زیادہ اور ناموافقت موافقت سے بڑھ کر ناہیچ بنادے گی جس ہاتھ میں ہاتھ دیا۔ اب اس میں محبت کی دھار ہو یا خنجر آبدار پرستش کروں گی۔ نسیم کلیجہ کا ٹکڑا اور سلطنتِ زندگی کا چراغ تھا۔ قسیم جان کا مالک اور سر کا سرتاج ہے۔ اس کا غصہ رحم اور اس کا ستم کرم، اس کا عتاب ثواب، اور اس کی اذیت شفقت ہے۔ نفرت کے قابل ہوں درست، غصہ کے لائق ہوں جائز۔ مگر عنایت کا نشان نفرت میں، اور محبت کی جھلک غصہ میں موجود ہے۔ رابعہ، ہاجرہ بچیاں ہیں۔ سمجھ نہ سکیں، غلط کہہ دیا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مجھ کو ان سے کچھ شکایت نہیں۔ میں اس پر قربان ہوں۔ یہ پاؤں دھو دھو کر پیوں تو بھی فرض سے سبکدوش نہیں ہوسکتی۔ آرزو یہ ہے کہ جن ہاتھوں نے پالکی سے اتارا وہی زمین کا پیوند کردیں اُمید ہے کہ مالک حقیقی میری آرزو پوری کرے گا۔ مجھے اپنے خدا پر بھروسہ اور اُس پاک ذات سے پوری توقع ہے کہ میری التجا قبول ہوگی اور وہی ہاتھ جو آپ کی دہلیز سے اس چوکھٹ تک لائے اس گھر سے اصلی گھر پہنچادیں گے۔ نسیم کی موت خون کے آنسو رلوا رہی ہے۔ دیوانوں کی طرح پھرتی ہوں، سودائیوں کی مانند رہتی ہوں، جانتی ہوں میری ذات سے اُن کو تکلیف پہنچ رہی ہے اور یہ صدمہ بھی کم نہیں۔ دنیا اور

دین دونوں برباد ہوئے۔ بچّہ کا فراق، شوہر کی ناخوشی، مجھ سے بڑھ کر بدنصیب کون ہوگا؟ اگر خیال سچّا اور توقع درست ہے تو میری موت وہ موت ہوگی جس سے دوزخ بھی پناہ مانگے گی۔ کوشش کر رہی ہوں کہ رضامند کر لوں لیکن زندگی کا اعتبار نہیں اگر موت آگئی اور آئی کیا آج آئی تو اور کل آئی تو آنا برحق اور ٹلنا محال۔ تو آپ سے درخواست ہے کہ نسیمہ کا جنازہ اُس وقت تک نہ اُٹھے جب تک قسیم اُس کے قصور معاف نہ کر دے۔"

قسیم مچھلی کی طرح تڑپ رہا تھا اس کی زبان سے صرف اتنا نکلا کہ "نسیمہ بیوی نہیں چندن اور عورت نہیں کندن تھی جو اپنی شہرت کا ڈنکا ایک عالم میں بجا گئی۔ میرا مُنہ اس قابل اور یہ گھر اس لائق نہ تھا کہ میری زندگی اُس حور سے اور میرا گھر اُس نور سے روشن ہوتا۔ خدا مرنے والی کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔"

(۲)

جب دنیائے ناپائدار کی اُس قابلِ ناز ہستی کا جو نسیمہ کی صورت میں بزمِ اسلام کی صنفِ نسواں کو منوّر کر گئی دمِ واپسیں شروع ہوا اور آپہنچا وہ وقت جب نسیم جیسے پھول اور وسیم جیسے شیر سے بچھڑ جانے والی ماں کی روح جس نے اپاہجوں کے زخم، ناتوانوں کے درد، بیماروں کے دُکھ اور یتیموں کی آہیں اپنے بچّوں کے مکھڑے تلاش کئے، جسدِ خاکی کو وداع کہے تو فرشتۂ موت نے باآوازِ بلند کہا کہ۔

آج عالمِ بالا میں اُس روح کا داخلہ ہے جو حیاتِ انسانی کے ہر جزو میں بے مثال رہی اور بے نظیر آئی۔ مُبارک تھی وہ دُنیا جو نسیمہ جیسی بیوی کا مسکن ہوئی۔ اور خوش نصیب

ہے وہ سرزمین جو اس نیک عورت کا مدفن ہو گی۔ دنیائے اسلام بالعموم اور دنیائے نسواں بالخصوص دیکھ چکی کہ کس طرح ایک مسلمان عورت ہر حیثیت میں چاند بن کر دمکی اور پھول بن کر مہکی۔ اب عالمِ ارواح دیکھے کہ دُنیا کی جنت کے پھولوں کا گہنا آج سنجیدہ کی مینا پر قربان اور سدا بہار پھولوں کے ہار اُس کے قدموں پر نثار ہوں گے۔ یہ ہے وہ انسان خود کا بھابی جس کا استقبال کرے گی اور مغفرت جس کو سر آنکھوں پر جگہ دے گی۔

بیٹی ہو کر ماں باپ کے، بہن بن کر بھائی بہنوں کے، چھوٹی ہو کر بڑوں، اور بڑی بن کر چھوٹوں کے حقوق اور خیال مرتے دم تک فراموش نہ کئے، بیوی بنی تو ایسی بنی کہ شوہر اور شوہر کے گھر والے ہر وقت اُس کا کلمہ پڑھتے، ماں ہوئی تو ایسی ہوئی کہ بچہ کامل تین سال تک اُس ملک میں اور اُس مقام میں اس شہر میں اور اُن لوگوں میں رہا جہاں خدا کا نام لینا گناہ اور مذہب کا خیال حرام مگر ایک وقت کی نماز قضا نہ ہوئی۔ دولت مند ہو کر حاجتمندوں کی اور طاقت ور ہو کر کمزوروں کی غلام بنی۔ مظلوموں کی اعانت اِس نے کی۔ قوم کی خدمت اِس نے کی حکومت میں نخوت اور دولت میں تمکنت پاس آ کر نہ پھٹکی۔ عزیز اس کے عاشق، محلہ اس کا پروانہ، بچے اِس کے شیدا اور شوہر اِس کا دیوانہ"۔

اب فرشتۂ موت نے اوپر نگاہ اُٹھا کر دیکھا اُترنے کا قصد کیا کہ ایک عورت کی روح سامنے آئی۔ فرشتے کے پاؤں پکڑ لئے۔ اور کہا۔

"کچھ شک نہیں کہ مسلمانوں کا طبقۂ نسواں روز بروز فرعون بے ساماں ہوتا جاتا ہے۔ تعلیم جدید نے اُن کے کان میں پھونک دیا ہے کہ دُنیا اُن کے واسطے اور وہ اپنے واسطے۔ گو وہ ایک اعتبار سے چنداں قصوروار نہیں اور اُن کے اِس انقلاب کے ذمہ دار وہ عقلمند مرد ہیں جن کی آنکھیں جدت کی لذت نے خیرہ

کر دیں۔ اور بغیر سوچے اور بلا سمجھے بیٹیوں کا ہاتھ پکڑ کر صراطِ مستقیم چھوڑ کر اس ڈبیہ پر ڈال دیا۔ جہاں کوسوں مذہب کا سایہ نہیں۔ مگر پھر بھی اس لئے کہ اُن کی زبان سے قدم قدم پر اسلام نکل رہا تھا وہ اپنے ہر کام کے خود جواب دہ ہیں۔ ترقی کے اس دَور، خود غرضی کے اِس عہد، اور افراتفری کے اس زمانہ میں نسیمہ جیسی عورت کا وجود جس نے ماں باپ کے غصّے، شوہر کی خفگی، بچوں کی اذیت، پڑوس کے دُکھ اور قوم کی مصیبت پر اپنی راحت، اپنا چین اور اپنا سُکھ قربان کیا، نعمتِ غیر مترقبہ تھا۔ جس دنیا کا عطر آج تم کھینچنے ہو اُس میں میں بھی چالیس برس کے قریب رہی۔ مردوں سے سابقہ ہوا، عورتوں سے پالا پڑا، تعلیم قدیم کو دیکھا، تعلیم جدید کو پرکھا۔ شوہر کا عیش کیا، ماں باپ کا پیار دیکھا۔ عزیزوں کی محبت دیکھی۔ بچوں کی کمائی کھائی۔ خوشی کی گھڑیاں دیکھیں، مصیبت کے پاپڑ بیلے، مگر جو محبت، جو کرم جو عنایت، جو خلوص اس نیک بی بی میں پایا جس کی روح تم قبض کرنے ہو، اُس کی مثال دوسری نہ ملی۔ میری گردن اِس کے احسان سے میں خود اس کے کرم سے اس قدر دبی ہوئی ہوں کہ اُس سے سُبکدوش ہونا آسان نہیں۔ عالمِ ارواح کے سردار کا مجھ سے اقرار ہے، کہ میری ایک التجا قبول ہوگی۔ میں نے اپنی درخواست آج ہی کے واسطے محفوظ رکھی تھی اور اب وقت ہے کہ تم اِس سے پہلے کہ نسیمہ کی روح قبض کرو میرا پیام اپنے سردار تک پہنچا دو۔ تم خود میری داستان سُنو اور بتاؤ کہ میری خواہش کہاں تک درست ہے۔

میں ایک خوش حال باپ کی پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ مگر اس لئے کہ ماں مر چکی تھی میری شادی کی زیادہ چھان بین نہ ہو سکی۔ یہ صحیح کہ باپ زندہ تھا اور یہ بھی درست کہ دوسری بیوی کا شوہر بھی نہ تھا مگر مرد تھا باتیں صحیح! اقرار درست! اور زبان سچّی سمجھ لیا اور نکاح کر ہاتھ میں ہاتھ دے دیا۔ اور میں ایک ساس کے پھندے اور

اور ایسے شوہر کے قبضہ میں جا پھنسی جو جاہل مطلق تو نہیں مگر کچھ ایسا پڑھا لکھا بھی نہ تھا۔ بیچ کی راسی کا انسان تھا۔ خیالات پست۔ اُمنگیں چھوٹی، حوصلے ذلیل اور یہ سب صرف اس وجہ سے کہ اُس کی صحبت خراب اور اُس کے دوست معقول نہ تھے مجھ کو پہلی مرتبہ اُس کی بے حیائی کا اندازہ اُس وقت ہوا جب وہ آٹھ دن کی بیاہی دُلہن کے واسطے گڑ کی گزک اور تیل کے سموسے لایا۔ لایا اور اصرار کیا اور زبردستی کھلا کر پیچھا چھوڑا۔ حاشا و کلاّ مجھے اس پر اعتراض جب تھا نہ اب ہے۔ وہ گڑ کی نہیں خالی تلوں کی اور تیل کے نہیں پانی کے سموسے لاتا۔ میں اس سے چوری کی متوقع اور ڈاکہ کی خواستگار نہ تھی۔ افسوس اس کا ہے کہ گزک تول میں پکی آدھ سیر اور سموسے گنتی میں پورے بیس، سڑ کر پھنکے اور پھپھوند کر گئے کہنے کو ایک معمولی بات تھی ہوگئی۔ مگر سموسے نابکار کافی یادگار، گزک نامراد پورا اثر چھوڑ گئی۔ تین دن اسی چکر میں رہی کہ شوہر نے نیا گُل کھلایا۔ اِس موت کے پھُول۔ اِس زخم کا نمک۔ اِس عنایت کا غضب، اور اس پر طرۃ یہ پیش آیا کہ ماں بیٹوں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ صاحبزادے صاحب فرماتے ہیں۔ "ہم تو جانتے ہیں کہ جنّت تمہارے قدموں میں ہے"۔ اِس سے کس کم بخت کو انکار ہو سکتا ہے سچ کہا درست کہا۔ مگر اس کے آگے کیا ارشاد ہوتا ہے کہ "تم آدھی رات کو کہو کہ کنوئیں میں جا گرو اور میں انکار کر دوں تو کلمہ نصیب نہ ہو"۔ میاں نے یقین دلایا قسم کھائی ساس بیٹھی سُنتی رہیں مگر مجھے معلوم ہو گیا کہ میاں چشمِ بد دُور اور ساس نُورٌ علیٰ نُور۔ اُٹھاؤ گونڈا۔ کُنبہ کا کُنبہ ہی بھونڈا ہے۔ ماں بیٹے سے سوا اور بیٹا ماں سے بڑھ کر۔ بند گیا سو موتی اور رہ گیا سو کنکر۔ نکاح گڑیا کا کھیل اور ترئی کی بیل نہ تھا۔ بندھنا تھا بندھ گیا سو موتی اور جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب میں اِس فکر میں رہی کہ بڑھے ہوئے لپکے اور پڑی ہوئی عادتیں کیونکر چھپاؤں۔ زندگی کی تلخی ظاہر اور عمر بھر کی بربادی پیش نظر تھی۔ یہاں اگر یہ الزام ابا جان پر رکھوں

تو شاید غلط نہ ہوگا کہ اُنھوں نے حالت دیکھی۔ صُحبت نہ دیکھی، ہڈی پرکھی، تربیت نہ پرکھی، بیٹی گھر کا کوڑا اور نکاح سر کا بوجھ نہ تھا کہ نکال باہر اور آتار ا الگ کیا۔ معصُوم چڑیاں عمروں کے سودے ہیں، جب زندگی ہی غارت ہوئی تو ہڈی کو بیٹھ کر کیا چچوڑنا ہے، دولت نہ ہوتی نہ سہی، حشمت نہ ہوتی مفقد۔ مگر اختلافِ مزاج تو نہ ہوتا۔ میری تعلیم یہ کہ مَردوں کے حقوق عورتوں پر اور عورتوں کے مردوں پر اِن کا عقیدہ یہ کہ ماں کے قدموں میں جنّت اور بیوی پاؤں کی خاک۔ مگر حق یہ ہے کہ قابلِ الزام وہ نہ ہیں۔ میری تعلیم نہ اُن کا عقیدہ۔ قابلِ الزام وہ ہیں جو اسلام کو بدنام کریں۔ یہ کام ماں باپوں کا تھا۔ اولاد کو بتاتے کہ ہمارے تم پر اور تمہارے حقوق ہم پر ہیں۔ کیا؟ ماں لپک کر ساس اور باپ جلدی سے خسر بننے کو ہو بیٹھے اور یہ نہ بتایا کہ پرائی جائی کے بیوی بن کر تم پر اور تمہارے شوہر ہو کر اُس پر کیا حقوق ہیں۔

المختصر مجھ کو اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ اُن کو اپنے رنگ میں ڈھالوں، یا خود اُن کے ڈھب پر ڈھل جاؤں۔ اُن کو اس طرف توجہ کرنے کی فرصت نہ موافقت کی ضرورت۔ مرد بچے جو جی چاہا کیا جو مُنہ میں آیا کہا۔ مصیبت تو میری تھی۔ عورت ذات جو پڑے وہ اُٹھاؤں۔ جو آئے وہ بھگتوں۔ کوشش شروع کی مگر اختلافِ مزاج کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ آسمان زمین کا فرق اور مشرق۔ مغرب کا بُعد تھا میرے اختیار میں ہو تو اپنی روٹی محلہ بھر میں تقسیم کروں، اور بچے بچائے ٹکڑوں سے پیٹ بھردوں۔ اُن کا بس چلے تو معصوم بچہ بلکتے کا بلکتا رہ جائے اور اُس کے ہاتھ سے جلیبی جھین کر صاف چٹ کر جائیں۔ ایسے شوہر سے نبھاؤ بڑی کٹھن منزل اور ٹیڑھی کھیر تھی۔ لوگوں نے سمجھانے میں جو درحقیقت سمجھانا نہیں بہکانا تھا کسر نہ چھوڑی اور ہر طرف سے یہی صدا کان میں آئی کہ شوہر کو چھوڑ چھاڑ میکہ

جالبساؤں۔ گویا باپ کا دَم موجود اور گھر کا دروازہ کھُلا ہوا تھا، اور میں خوب سمجھتی تھی کہ ابّا جان اگر میری پریشانی کی اُڑتی سی خبر سُن پائیں گے تو دونوں ماں بیٹوں کو نچادیں گے۔ مگر یہ بھی پورا یقین تھا کہ اِسی گھر میں مرنا اور اسی شوہر کو بھرنا۔ نکاح پھُولوں کا ہار یا لوہے کی زنجیر۔ یہ تقدیر پر منحصر ہے۔ مگر کچّا دھاگہ نہیں کہ جب چاہا توڑ دیا۔ جب ضرورت ہوئی جوڑ دیا۔ بڑوں کی مثل ہے۔ "لائیے سجنوں کی بیٹیاں جو رکھیں پنچوں کی لاج" گھر سے وداع ہونا تھا ہو گئی۔ اب پنچوں کی لاج اور بزرگوں کی آن میرے ہاتھ ہے۔

زندگی کا یہ دَور اگر غور کیا جائے تو تھوڑی یا بہت جیتے جی کی موت تھی کہ جذبۂ احساس، غیرت، حمیت سب خاک میں ملا کر مقصدِ حیات صرف ایک شخص کا رام کرنا رکھوں۔ پستی سے بلندی اور خدمت سے عظمت معلوم تھی مگر نفسانیت کا خاتمہ کرنا بھی آسان کام نہ تھا۔ لیکن دِلی شکریہ کے مستحق ہیں وہ ماں باپ جنہوں نے بچپن ہی میں پتہ گلوا اور تیہا نکلوا دیا تھا۔ گو ڈر بیٹی کہا۔ بھاری پتھر بنا دیا۔ الغرض مردوں کے مقابلہ میں مساوات کا خیال کبھی پاس آکر پھٹکنے ہی نہ دیا۔ اب اپنی حالت ظاہر اور اپنا درجہ روشن تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مصیبت کی گھڑیاں اور ذلّت کی کڑیاں، ماں کا دودھ اور شہد کا گھونٹ بنیں۔ کلیجہ چھلنی ہوتا تھا۔ دل پر گھونسے لگتے تھے مگر تیوری پر بل اور زبان پر شکایت نہ آتی تھی۔ بڑا زبردست بجر کا ساس کی جلتوائی تھی۔ جس نے ہر سفید کو سیاہی اور بھلائی کو برائی بنا دیا۔ کُتّوں سے بدتر زندگی اور لونڈیوں سے ابتر حالت تھی۔ کیا جو کر سکتی تھی اور کہتی رہی جو ہوتا تھا۔ مگر ان کوششوں کا نتیجہ اِس غلامی کا انجام پتھر پر کیا جونک لگتی شوہر دہی جان کا دُشمن اور ساس ویسی ہی خون کی پیاسی۔ میں پھر دہی کہتی ہوں کہ جب تک مسلمانوں کا تمدّن قطعاً تبدیل نہ ہو جائے اور شرع اسلام کے مطابق

عورت کی عزت نہ کرنے لگیں، لڑکیوں کو مساوات کی تعلیم دینا سمِ قاتل ہے تکلیفوں سے اُکتا کر اذیتوں سے گھبرا کر ایک آدھ دفعہ نہیں بارہا میں نے قصد کیا ہے کہ سب جھگڑے چھوڑ چھاڑ اپنا ٹکا سا دم لے نکل کھڑی ہوں۔ میری ہمت ٹوٹی۔ میری طبیعت چھوٹتی اور میرا جی گھبراتا، میں خود سٹ پٹاتی اور کہتی کہ موت اس زندگی سے تنہائی اس آبادی سے ویرانی اس مجمع سے اور رنڈاپا اس سہاگ سے بہتر، ہزار درجہ افضل اور اعلیٰ۔ لیکن وہی ایک خیال تھا جو اس آڑے وقت میں کام آیا۔ ابا جان کے الفاظ جو انہوں نے وداع کے وقت کہے۔ اماں جان کی نصیحتیں جو انہوں نے بچپن میں کیں کانوں میں گونج رہی تھیں۔ باپ دادا کی لاج ہر ہر پہلو سے اپنا رخ روشن دکھا غمگین دل کو تسکین دیتی تھیں اور دل خود بخود صدا دیتا تھا کہ نیت بھٹک گئی، قدم پھسل گیا طبیعت اُچٹ گئی تو بڑوں کی آن بزرگوں کی لاج سب خاک میں ملی۔ یہ ناصح مشفق اور مشیر و صلاح کار بغلی گھونسے ہیں۔ ہنسنے والے اور اُٹھانے والے۔ جلے پرائی دھی اور ہنسیں بٹاؤ لوگ۔ اس وقت تو چُنا چُنایا محل اور بنا بنایا کھیل ڈھا دیں اور بگاڑ دیں اور پھر قہقہے لگائیں۔ اور ٹھٹھے اُڑائیں۔ میاں ناخوش ہے تو خوش کر دیا، ساس ناراض ہے تو راضی۔ مختصر یہ کہ گو دل اُکھڑ چکا تھا مگر دماغ کا متواتر مشورہ یہی تھا۔

بندگی کرنے سے کہتے ہیں خدا ملتا ہے

پانچ برس کے قریب اسی طرح گذر گئے۔ ساس کلیجہ کی پھانس بنی نور کھٹکی ہے کر خاک ہو گئی۔ مگر اس نیک بخت کا دل نہ پسیجا۔ کم ہوں گی ایسی بدنصیب عورتیں جن کو اس قدر سخت مصیبت کا مقابلہ کرنا پڑا اور نہ ہوں گی اتنی کٹھور ساسیں شفقت اور محبت تو درکنار۔ رحم بھی جن کے پاس آکر نہ پھٹکا ہو۔

ظالم صورت دیکھ دیکھ کر بھُنی اور باتیں سُن سُن کر خستہ ہوئی جاتی تھی میں نے اپنے کام سے کام رکھا۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی کی یہ منزل کٹھن سے بھی سخت تھی، مگر بڑوں کی نصیحت امرت نکلی اِس دُکھ نے سُکھ دیا۔ اور یہ کلفت راحت ہوئی، ساس کی تیوری کا بَل تو نہ مٹنا تھا اور نہ مٹا۔ مگر ہاں میاں کی چیں بیں کم ہونی شروع ہوئی مرد ہوں یا عورتیں اور لڑکے ہوں یا لڑکیاں عمر عزیز کے دونوں اجزا اور دنیائے ناپائیدار کے دونوں مہمان شادی وغم خانۂ دل میں آتے اور جاتے رہتے اور گذرتے ہیں۔ زندگی کبھی ایسی فرحت کی خوشنما دیوی سامنے لاکر کھڑی کر دیتی ہے جس کا وہم وگمان بھی نہیں ہوتا۔ اور کبھی مصیبت کا وہ مہیب دیو پہلو میں لا بٹھاتی ہے جو واقعات ہی کا خاتمہ کر دے۔ میرے والد ماجد بیمار پڑے۔ علالت کی کیفیت۔ بدتری کی خبریں، سب میرے کان تک پہنچیں۔ میری آنکھیں روئیں میرا دل تڑپا۔ میری حالت بگڑی، میرا کلیجہ بیٹھا مگر دونوں مسلمان روحیں (جن میں سے آج ایک اماجان اپنے اعمال کی سزا بھگت رہی ہیں) یعنی شوہر اور ساس میری حالت پر نہ پسیجیں۔ میں اِس وقت پھر کہتی ہوں کہ غلطی پر ہیں۔ وہ مسلمان جو لڑکیوں کو مساوات کی تعلیم دے کر اُن کی زندگیاں برباد کر رہے ہیں۔ یہ تعلیم آفت، یہ تلقین مصیبت اور یہ یقین قیامت ہے۔ اگر اس افعی کا زہر چڑھ گیا، اور اِس میں اژدھے کی پھنکار نہ رُکی تو بس ہے جو گاؤں اور شہر ملک اور قوم سب کو ڈس کر چھوڑے گا۔ حکومت کا نشہ پہلے مردوں کے دماغ سے اُتارو اور جب مسلمان ہو جائیں اس کے بعد عورتوں کو اس سطح پر لاؤ قوم بُرا کہے یا بھلا اور دُعا دے یا بددُعائیں میں تو یہی کہوں گی کہ کنوارپنے کا زہر سُسرال میں شہد بنا اور میکہ کی ذلت سُسرال میں عزت سے بدلی۔ مساوات کا بخار اگر مجھے بھی چڑھ چکتا تو شاید ایک لمحہ بھی

گھر میں نہ نکلتی اور شوہر اور ساس کو چھوڑ چھاڑ کر بے پوچھے اور گچھے میکہ جا پہنچتی مگر شوہر کی برتری کا یقین رگ رگ میں تھا۔ دل پر جو گذری وہ میں جانتی ہوں مگر کٹ جائے یہ زبان اگر اُف بھی کی ہو۔ ساس کے کان پر تو کیا جُوں چلتی شوہر ہی کے دل میں خدا نے رحم ڈالا۔ میں صبح کی نماز پڑھ کر پان بنا رہی تھی اور ابا جان کے خیال سے کلیجہ کے ٹکڑے اُڑ رہے تھے کہ وہ سامنے آئے۔ میں نے آنسو پونچھ کر پان دیا۔ دیکھا، لیا اور سیدھے جا ڈولی لا مجھ سے کہا جاؤ تم اپنے ہاں ہو آؤ۔ میں گیا اور میری خدمت کیا۔ کچھ خدا ہی کی عنایت تھی۔ مگر اماں جان آئیں تو جائیں کہاں۔ ڈولی کی آواز سُن اور میری تیاری دیکھ آپے سے باہر ہو گئیں۔ اور ماں بیٹوں کی وہ جنگ ہوئی کہ خدا کی پناہ۔ مجھ کو اپنے کام سے کام تھا۔ جھگڑا ماں بیٹوں کا میں بولنے والی کون۔ دِن بھر رہ شام کو آ گئی۔ لیکن میرا یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ کنواری بچی اچھی طرح سمجھ لے کہ وہ نکاح کے وقت میکے ہی سے نہیں ماں باپ سے بھی وداع ہو رہی ہے۔ خدا نہ کرے کہ سنگ دلوں اور جاہل کٹڑوں سے پالا پڑے، مگر یہ مصیبت محال نہیں ممکن ہے کہ اِدھر لڑکیاں اور اُدھر ماں باپ ترس ترس کر اور پھڑک کر ختم ہو جائیں اور صورت دیکھنی نصیب نہ ہو۔ یہ اندیشے واقعات ہیں۔ اور خطرے معاملات جو دن رات پیش آ رہے ہیں۔ ان حالات میں مساوات کا بیج عورت ذات کے دل میں بربادی کا سلام اور موت کا پیام ہے۔ قصّہ کوتاہ اماں جان پہلے ہی جان کی دشمن تھیں۔ شوہر کے مہربان ہونے سے کریلا اور نیم چڑھا۔ نیک بخت نے دل کھول کر اور پیٹ بھر کر ستم توڑنے شروع کئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ اگر شوہر کی عنایت گو کیسی ہی کم کتنی ہی مختصر کیوں نہ تھی تسکین نہ دیتی تو میرے زخم پھُوٹ بہتے اور تعجب نہیں کہ میں اس زندگی ہی کو سلام کرتی۔ مجھ کو اس

قیامت اور مصیبت ہیں کہ ہر طرف سے اذیت ہی اذیت تھی ۔اُن کی عنایت غنیمت بلکہ امرت ہو گئی ۔ مگر میں اچھی طرح سمجھ گئی تھی کہ جو کچھ ہے محض ثمر خدمت ! اگر ذرا تیوری پر بل آیا تو بنا بنایا کھیل بگڑا ۔ پہلے سے زیادہ سیوا کی اور توقع سے بڑھ کر میوہ کھایا اور وہ دن بھی آ پہنچا کہ میاں کو بھی یقین نہیں تو شبہ ضرور ہو گیا کہ ماں ظالم، بیوی مظلوم ۔

ہماری آمدنی جائداد کا مختصر کرایہ تھا ۔شوہر صاحب اُٹھانے کو تو بہت شیر تھے مگر کمانے کو خاک نہیں ۔ میرے بہت کہنے سُننے بامنت خوشامد سے کبھی تلاش میں گئے بھی تو نوکری ملنے سے پہلے ہی افسر میں ہزار کیڑے ڈال دیئے ۔اس پر ستم یہ کہ کھانے کے بھی شوقین اور کپڑے کے بھی گو یہ شوق اپنی ہی ذات تک محدود تھا اور میں یا میرے بچے اِس بلا سے محفوظ مگر کبھی مہربان ہوئے تو مٹھائی کی ایک آدھ ڈلی کباب کا آدھا پاؤ ٹکڑا مجھ کو بھی مرحمت ہو گیا ۔بچوں بیچاروں کو تو حکم ہی نہ تھا کہ کھانے وقت باپ سے مانگنا تو درکنار اُس طرف آنکھ اُٹھا کر بھی دیکھ لیں ۔غضب یہ تھا کہ اُن کے اِس فعل کو ماں نے بھی ہمیشہ جائز سمجھا ۔ اور بھُولے سے بھی باپ کے کھاتے وقت کوئی بچّہ اُدھر نکل گیا ، تو بیٹے سے پہلے ماں کی آنکھوں میں خُون اتر آیا ۔ حقّہ کا شوق یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ انجنوں کو بھی مات کیا ۔ دن رات حقّہ ہاتھ میں ۔ گرمی کا ابتدائی موسم تھا ۔ آندھیاں زور شور سے آ رہی تھیں ۔ میں نے اس دُنیا میں بھی کہا اور اِس میں بھی کہتی ہوں ۔ اُن آدمیوں کے سامنے بھی اقرار تھا ۔ اور تم فرشتوں کے سامنے بھی ہے کہ میں نے اچھی طرح آگ دبا اوپر سے توا ڈھانک دیا مگر نہ معلوم کیا جوگ پڑا کہ گھر میں آگ لگ گئی ۔ جب شُبہ تھا اور اب یقین ہے ۔ جب نہ کہا اور اب کہتی ہوں کہ دبی دبائی آگ چپکے نہ تھی کہ نکلتی اور پھر نکلتی ۔ حقّہ میرے بعد

بھر گیا۔ آگ دبی نہیں۔ رات کا وقت۔ گھر بے خبر آندھی زور شور کی ہولے اُڑی
میری آنکھ کھُلی تو بغلی دالان اور سامنے کا کمرہ دھڑ دھڑ جل رہا تھا۔ دم خشک ہو گیا
گھبرا کر اُٹھی، آواز دیتی ہوں تو نکلتی نہیں، پکارتی ہوں تو بولا نہیں جاتا۔ دالان کے
آگے ٹین کا سائبان تھا۔ بچوں کی چارپائیاں وہیں تھیں۔ ایک طرف اُن کے باپ
کی آگ ٹین تک پہنچ چکی تھی۔ اور بڑے سے چھوٹے تک سب پڑے خراٹے لے
رہے تھے۔ بھیڑ کی لات گھٹنوں تک۔ میں اس کے سوا کر ہی کیا سکتی تھی کہ پانی بھر کر
ڈالنا اور چیخنا شروع کیا۔ جاگ تو سب پڑے مگر پانی تقدیر سے تیل کی طرح بھڑکا
اور آگ کے شعلے ہوا سے باتیں کرنے لگے۔ اماں جان گھبرا کر باہر آئیں۔
دونوں بڑے بچے بھی نکل آئے اور اُن کے ابا بھی۔ مگر دونوں چھوٹے تین برس
کی بچی اور ڈیڑھ برس کا بچہ وہیں رہ گئے۔ میری جان اُن میں پڑی ہوئی تھی۔ اور کلیجے کے ٹکڑے
غافل پڑے تھے۔ میں نے بلبلا کر ایک ایک کا مُنہ حسرت سے تکا اور گڑگڑا کر
ایک ایک سے التجا کی کہ میرے بچے اندر ہیں۔ آنے کو سارا محلّہ بلکہ اور بھی اِدھر
اُدھر کے لوگ آ بھرے تھے لیکن ایک کی ہمّت نہ ہوئی کہ موت کے مُنہ سے
میرے معصوموں کو چھڑا دیتا۔ ستم یہ تھا، غضب یہ تھا کہ میری آنکھوں میں
دنیا اندھیر تھی اور امّاں جان آگ کا سارا الزام میرے سر تھوپ رہی تھیں
غصّہ کی کوئی انتہا، نصیحتوں کی کوئی حد۔ سارے کنبہ اور پورے خاندان کو
اُلٹ ڈالا۔ مامتا اگر کوئی معنی رکھتی ہے تو دُنیا والے ایماندار اس کا فیصلہ
کریں! اولاد والے ماں باپ بتائیں کہ کیا گذر رہی ہو گی۔ اِس کم بخت دِل پر جس
کے ایک چھوڑ دو دو بھُلر واسے لال اس کی آنکھوں کے سامنے آگ میں بھُن رہے
ہوں۔ موت چیل کی طرح اُن کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔ شعلے دالان میں نہیں
میرے کلیجہ پر تھے مگر کان برابر اُلٹی چھُری سے ذبح ہو رہے تھے۔ یہ توقع اس

وقت غلط تھی مگر آج صحیح ہے کہ انسانی صورت میں وہ گروہ جو حکومت کے واسطے عورت پر فضیلت کا مدّعی ہے میرے سامنے تھا۔ مگر اُن کے کلیجے پر پتھر تھے۔ اُن کی آنکھیں بے خبر تھیں۔ اُن کے دِل لوہا تھے وہ مسلمان تھے، اُن کا مذہب اسلام تھا۔ لیکن اُن میں سے ایک متنفّس ایسا نہ تھا کہ گھر کی نہیں ماں کی آگ کو ٹھنڈا کر دیتا! میں جانتی ہوں، مجھے معلوم ہے، میں نے پڑھا ہے کہ تعلیم یافتہ مسلمان، ترقی یافتہ افراد بغیر وجہ کے بات نہیں کرتے اور مجھے اِن سے توقع کا کوئی حق نہ تھا مگر یہ کیا اندھیر تھا کہ بڑے سے چھوٹے تک ہر شخص میرے دیکھنے اور لُطف اُٹھانے والا تھا۔ یہ صحیح کہ ہر جدّت میں لذّت ہے اور یہ منظر معمولی نہ تھا ایسے موقعے کم دیکھنے میں آتے ہیں۔ مگر اتنا میں اب بھی کہوں گی اگر اُن کا فیصلہ یہ ہے کہ قابلِ ملامت ہیں وہ ہستیاں کہ جب اعانت کے قابل اور دستگیری کے لائق نہیں تو آنے کی وجہ؟ ٹھہرنے کا سبب؟

جہیز کے کپڑے میرے سامنے جل کر خاک، تانبے اور پیتل کے برتن میری موجودگی میں تپ تپ کر راکھ ہوئے۔ مگر مجھ کو اپنے بچّوں کے سوا کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔ میں نے لوگوں سے کہا مگر وہ کیوں سنتے، میں نے اُس سے التجا کی جو فقط میرے ہی رنج و غم کا شریک نہیں مُصیبت زدہ معصوموں کا باپ تھا۔ وہ میرے نہیں اس کے بھی کلیجہ کے ٹکڑے اور آنکھوں کی ٹھنڈک تھے۔ لیکن بدنصیب آنکھیں جو درخواست کے وقت اُس کی ہمدردی کی منتظر تھیں۔ اُس کی خاموشی کو دیکھ ناکام لوٹیں۔ رات آدھی سے زیادہ گُذر چکی تھی۔ ہُوا کا نقارہ چاروں طرف بج رہا تھا، اور آگ کے شعلے لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہے تھے۔ آسمان کی خاموش محفل جمی ہوئی تھی۔ چادرِ مہتاب میرے قدموں اور تارے میرے سر پر تھے کہ میں اُس کی طرف بڑھی، جو سچّا وارث اور حقیقی بادشاہ ہے

میری زبان بند تھی۔ میری آنکھوں نے اُس کو سجدہ کیا۔ ابھی میری التجا ختم نہ ہوئی تھی کہ میرے برابر ایک بُرقع پوش عورت آئی اور کہا "بچے کوئی دم میں خاک ہوئے۔ چلو لڑکے کو تم اور لڑکی کو میں لیتی ہوں" عورت اتنا کہہ کر آگ میں گھُس گئی اور اُس کے پیچھے پیچھے میں۔ اس نے لڑکی کو اُٹھا لیا۔ میں تو کہتی ہوں وہ بی بی جنّت کا فرشتہ اور آسمان کی حور تھی۔ بچّی کو کلیجہ سے لگا کر بُرقع اُٹھا اپنی جان قربان کر باہر نکلی۔ اُس کی قربانی نے میری ہمت، اُس کے اسلام نے میرا دل، اور اُس کی انسانیت نے میرا حوصلہ بڑھا دیا۔ اور میں بھی بچّہ کو لے کر باہر آئی۔ خلیل کی آگ گلزار کرنے والا خدا ہمارا مددگار تھا۔ ہم زندہ سلامت نکلے اور بچّی پر بھی آنچ نہ آئی مگر بچّہ جو میری گود میں تھا جل گیا۔ ڈیڑھ برس کی بساط ہی کیا تھی ایک ٹانگ بھُرتہ ہوگئی۔ خدا دشمن کو وہ گھڑی نہ دکھائے۔ بچّہ کی ایک چیخ زمین اور ایک آسمان پر تھی۔ مائیں جان سکتی ہیں کہ اس عالت کرب میں خاموشی سے مُنہ کھولنا اور میرا مُنہ تکنا مجھ سے کیا کہہ رہا تھا۔ اماجان (میں وہاں بھی کہتی تھی اور یہاں بھی کہتی ہوں) خدا بخشے صاحب اولاد تھیں۔ مامتا سے آشنا اور تنگی سے واقف۔ مگر اُن کو اس تکلیف یا موت دونوں سے واسطہ نہ تھا۔ اُن کو قلق تھا اور میں کہتی ہوں کہ بجا تھا۔ اُن کو صدمہ تھا اور مجھے اقرار ہے کہ درست۔ اُن کو غم تھا اور میری رائے میں ٹھیک کہ گھر میں آگ لگی، مال برباد ہوا۔ جمع غائب ہوئی۔ لیکن ہر چیز پیدا ہو جانے اور ہر نقصان پورا ہو سکنے والا تھا، مگر سعید جیسا لال ماں کے کلیجہ سے بچھڑ کر دوبارہ چمٹنے والا نہ تھا۔ اُن کو اگر محبت نہ تھی نہ سہی، ہمدردی نہ تھی بلا سے مگر غضب یہ تھا کہ وہ اس حالت میں بھی آگ کا بار مجھ پر رکھ رہی تھیں۔ مجھ کو بچّے کی صحت کی اور اُن کو میری لاپروائی کی تسبیح تھی۔ میں لاکھ برباد ہزار غریب تھی اور فرمانبرداری میرا شیوہ مگر میرے حواس اور عقل ٹھکانے ہوتی تو یہ نہ ہوتا کہ خاموشی شوہر کو بھی جُرم کا یقین

دلادیتی، حیا جزد ایمان اور بزرگوں کے سامنے خموشی جوہر شرافت ضرور مگر ایسے موقعوں پر حیا اور ادب دونوں حماقت۔ لیکن میری خموشی شرافت نہ حماقت مجبوری تھی اور معذوری، مجھے اگر ہوش تھا تو صرف اتنا کہ بچّے کو نکال اُس فرشتہ غیبی کو دیکھا جس نے عورت ذات ہو کر مردوں کو مات کیا اور دکھا گئی کہ ابھی اسلام کے نشان مسلمانوں میں موجود ہیں۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا چاروں طرف ڈھونڈا مگر وہ صورت نظر نہ آئی، رات کتنی تھی کٹ گئی۔ پو پھٹ رہی تھی کہ بچّہ نے آنکھ کھولی اماجان چیخ پیٹ کر شوہر صاحب بگڑ بگڑا کر سو چکے تھے۔ اور میں اِس پھول کو ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی تھی۔ اس کا آنکھ کھولنا اُس جنت سے جو آج میسر ہے اور اُس نعمت سے جو اس وقت حاصل ہے کم نہ تھا۔ اماجان کا نقصان اتنا کیا اگر اس سے ہزار گنا زیادہ ہوتا میں اُس صورت پر قربان کرنے کو موجود تھی۔ میں نے اس لوتھڑے کو جو اُن کو مصیبت اور مجھ کو راحت تھا، سینہ سے لگایا۔ بچّہ کہنے کو ڈیڑھ سال کا تھا لیکن ایک پھول تھا۔ جس نے گھر بھر کو ایک مینا تھی جس نے سارے محلہ کو مہکا اور چہکا رکھا تھا۔ اس غضب کی باتیں بناتا اور اس قیامت کے فقرے ڈھاتا تھا کہ سُننے والے بھی لٹو ہو جاتے تھے۔ ماں بیٹے بے خبر پڑے سوتے تھے اور میں کندھے سے لگائے دوا کی فکر میں ٹہل رہی تھی۔ آفتاب کی مدھم شعاعیں تیزی سے اور بچّہ کی خفیف آواز سختی سے تبدیل ہوئی اور اس کے بعد ہی اماجان کلمہ پڑھتی اُٹھ بیٹھیں۔ حاشا و کلا میرا یقین اب تو کیا جب بھی نہ تھا کہ دادی سعید کی دشمن ہیں۔ وہ اگر میرا لال تھا تو اُن کے لال کا لال ماں کے بعد اُن سے زیادہ شفیق اور باپ سے انتر کر اُن سے زیادہ رفیق اور کون ہو سکتا تھا۔ مگر اُس کا قصور صرف اتنا تھا کہ وہ مجھ دشمن کا دوست، سو دشمنوں کا دشمن تھا۔ اور میری دشمنی تھی محض مشارکت پر کہ سعید کے باپ اُن کے صاحبزادے

اور میرے شوہر سچ پوچھو تو یہ مشارکت صرف سمجھ کا پھیر اور طبیعت کی کمزوری تھی۔ ورنہ اُن کا رشتہ جدا، میرا تعلق الگ، شرکت کا واسطہ کیا۔ یہ مسلمانوں کا تمدن اور ماؤں کی توقعات کہ لڑکوں کی پرورش اور خدمت کریں، اپنی مامتا کو، اور کریں کیا کرنی پڑے۔ قدرت کے قانون اور فطرت کی مجبوری سے اور توقع رکھیں معاوضہ کی۔

میں ہرگز ہرگز نہیں کہتی کہ لڑکے شادی ہوتے ہی ماؤں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال باہر کریں۔ اُن کا حق بجا، اُن کی محنت جائز، میں جانتی ہوں جنت ماں کے قدموں میں ہے لیکن اولاد سے توقع اتنی رکھیں جتنا خود ماں باپ کے ساتھ کیا غیر مرد کی بیوی بنی اپنے ماں باپ کو سلام کیا، بیٹا غیر عورت کا شوہر ہوا، ماں کی جتنی خدمت کرے غنیمت یہ کیا مصیبت ہے کہ میاں بیوی کے واسطے جڑاؤ گلوبند لایا اور اماں جان کی آنکھوں میں خون اُترا! کیوں؟ اس لئے کہ توقع تھی کہ اس کی تمام کمائی کی مالک اور آمدنی کی مختار ہیں۔ پالا پوسا، پڑھایا لکھایا میری وجہ سے اس لائق ہوا کہ کچھ کما سکے۔ کس قدر لغو توقع لچر خیال اور فضول اُمید ہے۔ ایسی غلطی کا شکار میں ہوئی۔ اور ایک میں کیا، خدا مسلمانوں کو رکھے، اُن کے تمدن کو رکھے، اُن کی نفسانیت کو رکھے، نہ معلوم کتنی نازک ہستیاں اور معصوم روحیں اس دیوی کی بھینٹ چڑھیں اور چڑھیں گی۔

بچّہ میری گود میں تھا اور میں دوا کی دُھن میں غرق کہ اماں جان میرے پاس آئیں بچّہ کو گود میں لیا چمکارا پیار کیا ٹانگ دیکھی، پھپھولے دیکھے، اور کہہ دیا۔ "کچھ نہیں مٹکے کی کاہی اور دوات کی سیاہی لگا دو۔" شوہر صاحب بھی اُٹھ بیٹھے تھے اور اب اماں جان کی گفتگو میں سوا مالی نقصان کے بچّہ کا ذکر تک نہ تھا۔ آگ کی خبر سُن کر اباجان بھی تشریف لائے اور یہ پہلا اتفاق تھا کہ وہ میری چوکھٹ پہ

تشریف لائے۔ اماّ جان نے اُن کی دل آزاری میں کوئی کسر نہ چھوڑی اور اُن کو اس محبت کی ایسی کافی سزا دی کہ شاید اس عالمِ ارواح میں بھی وہ ذائقہ یاد ہوگا۔ مجھ پر جو گذری وہ سُنانی مشکل اور بیان کرنی ناممکن۔ اِدھر ماّمتا نے میرے ہوش وحواس زائل کر دیئے تھے اُدھر اُن کی زبان درازی اور اُس پر طرّہ اباّ جان کی خاموشی۔ میرے دل پر تیر لگے، میرے کلیجہ پر بجلیاں کوندیں۔ مگر بچہّ کے آگے اپنا خیال رہا نہ باپ کا۔ اباّ جان ہنسنے لگے تو میں نے کہا: "ڈاکٹر یا حکیم کو بلا لیجئے۔" انھوں نے مجھے تو جواب نہ دیا چُپکے سے جا ڈاکٹر کو ساتھ لا بچہّ کو دکھایا۔ میرے زخم کو اور چرکا لگا بات کا بتنگڑ مَیل کا بَیل اور تِل کا پہاڑ بنا اور اماّ جان نے ان دونوں کے مُنہ پر صاف کہہ دیا: "مفت کا روپیہ حرام کی دولت ڈاکٹروں کو دو دَوائیں اُٹھاؤ خواہ مخواہ کے نکتوڑے بچہّ اچھا بھلا، جلنے کا نشان نہیں، پھپھولے کا پتہ نہیں۔ وہی پُرانا دُکھ رہتی ہے۔"

میں تو کیا جواب دیتی اباّ جان اور ڈاکٹر دونوں مُسکرا کر خاموش ہوگئے دوا اور مرہم آئی مگر پلائی نہ لگائی۔ اِرادہ ہی کر رہی تھی کہ اماّ جان آئیں۔ دونوں چیزیں اُٹھائیں اور کہا: "ایسا غضب بھی نہ کرنا کہ یہ آگ دے دو۔ بچہّ بچکا بھی نہ کھائے گا۔ ایسی ویسی ہوگئی تو تمہارا کیا جائے گا۔ ہمارا پلا پلایا بچہّ ہاتھ سے جاتا رہے گا۔" بس مُنہ تکتی رہ گئی اور وہ دَوا کی شیشی اور مرہم کی ڈبیہ لے چلتی ہوئیں۔ میں تم اَن دیکھوں کے آگے اِس مقام پر جہاں جھوٹ کی ضرورت نہ سچ کی حاجت خدا کو گواہ کر کے کہتی ہوں کہ بارہ تیرہ گھنٹہ کا لمبا دِن صاف گذر گیا مگر اس معصوم بچےّ کو دوائی ڈھنڈائی نصیب نہ ہوئی۔ دونوں ماں بیٹوں نے میرے سامنے کھانے کھائے۔ مگر اُن کو مجھ سے پوچھنا قسم تھا۔ رات اپنے ساتھ مصیبت کا پہاڑ لیئے سر پر آئی۔ اور وہ وقت بھی آگیا کہ بے ہوش بچہّ کو گود میں لئے میں اُس صورت کو تک رہی تھی۔

جو اور ایک آدھ دن کی مہمان تھی، اپنے جوش میں جھپٹ جھپٹا کر منہ میں دودھ دینی تھی منت کرتی تھی اور ناکام رہتی تھی۔ رات میری آنکھوں میں کٹی چاند میرے سر پہ چمکا، تارے میرے سامنے جھلملائے اور گو یہ ہر تغیر بجائے خود فنا کا سبق اور انقلاب کا ثبوت تھا مگر دل کو کسی طرح تسکین نہ ہوتی تھی۔ میں اس کی بلائیں لیتی تھی، فدا ہوتی تھی، قربان ہوتی مگر وہ اپنی اس امانت سے جو قدرت نے دودھ کی صورت میں میرے پاس رکھی بیزار ہو چکا تھا۔ اس کے ہونٹ کام کے قابل، اس کا دماغ سمجھنے کے لائق نہ رہا۔ وہ میری آواز کا پروانہ تھا لیکن اب وہ آواز جس نے رونے کو ہنسایا۔ اور بلکنے کو بہلایا بے سود تھی اور وہ معصوم ہنسی جس نے ہُمک ہُمک کر ہنس ہنس کر اور کھیل کھلا کھل کھلا کر میرے دل کی کلی کھلائی ننھے ننھے ہاتھوں سے میری خدمت کی، اور پیاری پیاری نظروں سے باغ باغ کیا۔ میری آغوش میں خاموش تھی۔ جو کلیجہ سے لگتے ہی منہ میں دودھ لے کر محبت بھری نظروں سے مسکرا دیتا تھا، جو گلے میں ہاتھ ڈال کر بھینچ بھینچ کر چمٹا اس وقت اس کی آنکھیں بند تھیں اُس کے ہونٹ خاموش تھے، اُس کے ہاتھ بیکار اور وہ خود لاچار انسان اور انسان بھی عورت، عورت اور عورت بھی، صرف ماں اور فقط ماں سمجھ سکتی ہے کہ میری کیا کیفیت ہو گی جب میں دیکھتی ہوں گی کہ میرا بچہ میری آواز کو پہچانتا ہے۔ آنکھیں کھلنے کی ہونٹ مسکرانے کی کوشش کرتے ہیں مگر ایک ٹھنڈا سانس، ایک لمبا سانس میری آواز کے جواب میں مجبوری کا اظہار کرتا ہے ہولے ہولے صدائے حق کان میں پہنچا کر بے ثباتی دنیا کا نقشہ میری آنکھوں میں کھینچا تو میں نے دیکھا کہ آنکھوں کا تارا منہ کھول رہا ہے، بیتابانہ اُٹھی کہ حلق میں شربت ٹپکاؤں مگر موجود نہ تھا چھاتی سے دودھ چمچہ میں نکالا اور حلق میں ڈالا۔ یہ صبح کا وقت تھا اُس وقت پھر اُس نے آنکھ کھولی بخار ہلکا تھا۔ میں اُس کے منہ پر منہ رکھ کر بلبلائی اور کہا "اے چاند! مجھ بدنصیب پر رحم کر" اُس نے میری طرف ہاتھ اُٹھایا۔ میں اس ہاتھ پر قربان ہو رہی تھی کہ اباجان ڈاکٹر کو

لے کر گئے۔ اُن کو کیا معلوم کہ مظلوم معصوم کو بد نصیب ماں کے ہاں دوا تک نصیب نہ ہوئی۔ میں بھی خاموش رہی۔ ڈاکٹر نے کہا "آج اندیشہ کم ہے وہی دوا دو بھی اور لگاؤ بھی۔" دونوں ذرہی قدم گئے ہوں گے کہ منجھلی اُستانی مسکراتی ہوئی اندر گھسیں اُن کی صورت دیکھتے ہی اَنّا جان کھل کھلا کر ہنسیں اور کہا۔

"اللہ بی اُستانی! کل سے تین آدمی بھیج چکی ہوں۔ مگر تمہیں گھر سے نکلنا نصیب نہ ہوا۔" بچہ ہاتھوں میں آ گیا۔

اُستانی "لے ہے بیوی دم بھر کا چھٹکارا نہیں۔ سارا دن اور ساری رات اسی آر جار میں گذر رہی ہے۔ گھر تک پہنچنا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ راستہ میں پکڑی جاتی ہوں۔ کل صبح کی نکلی ہوئی ہوں۔ ڈپٹی صاحب کی بہو نے نکلنے ہی نہ دیا۔ آٹھ برس کا پہلونٹھی کا لڑکا کوٹھے سے گر پڑا۔ ڈاکٹر حکیم یہ سب ہی آئے اور گئے۔ ہونا کیا تھا وہاں دُکھ ہی دُوسرا تھا۔ میں تو کس قابل ہوں۔ جب اس وقت ذرا بچہ نے بات کی تو اُن کی جان میں جان آئی اور رخصت ملی۔ وہ بھی دو گھنٹہ کو، لاؤ دیکھوں بچہ کہاں ہے۔"

میری جان تو پہلے ہی نکلی جا رہی تھی۔ اُستانی کم بخت کو دیکھ کر بالکل ہی خون خشک ہو گیا۔ میں جانتی تھی کہ ایک چلتی ہوئی حرّافہ عورت ہے جس کو آنا جانا خاک نہیں مگر دخل دُنیا بھر کے کاموں میں۔ ڈاکٹر وہ، حکیم وہ۔ ملا وہ۔ سیانی وہ۔ بچہ کی صورت دیکھ کچھ سوچا اور کہنے لگی "بچا مجھ سے بچ کر کہاں جاؤ گے آگے آگے تم اور پیچھے پیچھے میں۔"

اَنّا جان۔ "وہی خلل ہے۔"

اُستانی "اور کیا ہوتا مگر میرا نام بھی اُستانی ہے۔ ڈپٹی صاحب کے یہاں سے بھگایا تو یہاں آ بیاجے۔ تم ایک کام کرو۔ ایک تو سات مرچیں لال لے آؤ۔ ایک

پیسہ' اور تھوڑی سی آگ ، پیسہ دہکا کر ماتھے پر داغ دیتی ہوں اور مرچوں کی دھونی اس گھر میں تو کیا پڑوس تک میں بچا کی صورت نہ دیکھنا۔"

تم فرشتے ہو۔ تم کو شاید قدر نہ ہو۔ یہ وہ وقت ہے کہ بیمار بچہ جو مرض الموت میں گرفتار ہے۔ میرے کلیجہ کا ٹکڑا جو میرے گھر میں کوئی دم کا مہمان ہے میرا معصوم لال جو میری بھری گود خالی کر رہا ہے اس کو دوا نصیب نہ ہوئی اور آگ کی دہکتی ہوئی انگیٹھی' مرچیں اور پیسہ لاکر رکھا گیا۔ ہائے اب بھی بیان کرتے کلیجہ کے ٹکڑے اُڑتے ہیں۔ جھلسا ہوا معصوم جس کی ٹانگ بھر نہ ہے ظالم دادی اور قصائی باپ کی بدولت پیسہ سے داغا جائے کہ پھر دُکھ نہ اُٹھے۔ پیسہ سُرخ انگارا نکالا گیا۔ مجھے چکر آئے۔ میں شوہر کے قدموں پر گری اور کہا "لِلّٰہ رحم رحم، خدا کا واسطہ رحم' مر رہا ہے، دم توڑ رہا ہے یہ ظلم نہ کرو۔ یہ ستم نہ توڑو۔ میری دو سال کی محنت ہے۔ یہ میرے پیٹ میں اس دِن کو نہ رہا تھا۔ یہ میرے گھر میں اُس وقت کو نہ کھیلا تھا کہ بدنصیب ماں مظلوم لال کو مرتی دفعہ پیسہ سے داغ کر رخصت کرے۔" اُستانی کے قدموں میں دوپٹہ، ساس کے قدموں میں سر شوہر کے قدموں میں خود۔ ہاتھ جوڑ کر کہا، گڑگڑا کر کہا۔ شوہر پر التجا کارگر ہوئی مگر اُستانی کی عیاری اماں جان کے دل پر جم چکی اور اُن کا اصرار بدستور تھا کہ دروازے سے آواز آئی: "ڈولی اُترو الو۔" آنے والی بیوی کی صورت دیکھتے ہی اُستانی کے ہوش اُڑ گئے اور سٹ پٹا کر کہا: "بیگم صاحب آداب۔"

آنے والی: "وعلیکم السّلام۔ کیوں یہاں کیسے گذر ہوا۔ کیا یہ بچہ بھی مسان میں دبا ہوا ہے؟" اُستانی کھڑی تو صورت دیکھتے ہی ہو گئی تھیں۔ مگر سلام کے جواب میں یہ سُنا تو بُز دفع سنبھال صرف اتنا کہا "جی نہیں۔ اِن کے کئی آدمی جاچکے تھے اس لئے حاضر ہو گئی۔"

جواب تو اُستانی صاحبہ نے دے دیا مگر چہرے پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں
آنے والی نے کڑک کر کہا "یہ مکاری کب تک اور یہ عیاری کہاں تک۔ اب تم
جیل خانے جاکر ٹھیک ہوگی۔"

اُستانی: "نہیں بیگم میں نے تو قسم کھالی ہے"

آنے والی: "اِن فریبوں سے کیا فائدہ جاؤ غارت ہو۔ نکلو۔"

اُستانی تو اس طرح بھاگیں جیسے لاحول سے شیطان اُن کے بھاگنے سے
میری جان میں جان آئی۔ آنے والی نے اب میری طرف دیکھا اور کہا "کیوں بی بی؟
آج آپ کا بچّہ کیسا ہے۔؟"

میں اس بی بی سے مطلق واقف نہ تھی اور تعجب یہ تھا کہ اماں جان بھی۔ تاہم
جب انہوں نے بچّہ کو پوچھا تو میں نے کرایہ باہر بھیجنے کا قصد کیا۔ انہوں نے منع کیا
اور کہا "جی نہیں۔ ہم عورتوں میں یہ رسم بھی ہے کہ آنیوالے کرایہ اپنے پاس سے موت
کے وقت دیں ورنہ ہر حال میں صاحب خانہ سے دلوائیں کیونکہ وہم آتا ہے۔ مجھے
پسندیدہ نہیں۔ آنے کی خواہش میرے دل میں پیدا ہوئی، ذمّہ دار میں ہوں۔ آپ پر
کیوں پڑے۔ یہ خواہ مخواہ کی سزا دینی ٹھیری جس شخص کو نقصان پہنچانا چاہا گاڑی
کرا دھکیلے اور کرایہ کی ہتیا دے دی۔ کرایہ دے دیا جائے گا۔ آپ فکر نہ کیجئے مہربانی
فرماکر ذرا بچّہ دکھلا دیجئے۔ اب کیسا ہے۔؟"

میں خاموش تھی انہوں نے آگے بڑھ کر بچّہ دیکھا اور پوچھا "کیا پلایا
اور کیا لگایا؟"

اماں جان نے کہا "ابھی تو گھری کی چٹی پٹی ہو رہی ہے۔" آنے والی بیوی
اسی وقت ڈولی میں بیٹھ اُلٹی گئیں اور تھوڑی دیر بعد پینے کی اور لگانے کی دوا
لائیں اور اپنے ہاتھ سے پلاسٹر لگا میرے پاس ہو بیٹھیں۔

فرشتہ اور حوریں تو یہی کہوں گی قربان کئے تھے اُس بی بی پر اُس نے ماں کی شفقت اور بہن کی محبت سب بھلا دی۔ بچّہ کو گود میں لیا۔ مجھ کو تسکین دی اور دن بھر دوائی ٹھنڈائی کرتی رہی۔ چار بجے ہوں گے جس وقت اُس نے نمازِ عصر کا وضو کیا ہے۔ تو میں نے دیکھا کہ ہاتھ جلا ہوا ہے! یہ وہی بی بی تھی جو اُس رات کو میرے ساتھ بھڑکتے ہوئے شعلوں میں گھُسی! میں اس قدر متحیّر تھی کہ زبان اُلٹ نہ سکتی تھی۔ خاموش اُس کا منہ تک رہی تھی۔ ہمدردی جو آدمیت کا سبقِ اوّل ہے۔ خلوص جو انسانیت کا عین منشا ہے۔ صداقت جو اسلام کا بہترین جوہر ہے، اُس کی بات بات اور رگ رگ سے ٹپک رہا تھا۔ میرا منہ نہیں کہ اس کی تعریف، ممکن نہیں کہ اُس کا شکریہ ادا کر سکوں، اُس نے آگ میں کود کر میری مامتا ٹھنڈی کی۔ ظالم اُستانی کے پنجہ سے میرا لال نکالا۔ خدا کی عنایت دیکھو کہ اُس کے ہاتھ میں برکت دی۔ نیّت میں صداقت تھی۔ محنت ٹھیک لگی۔ بچّہ گھنٹوں، اور گھڑیوں، لمحوں اور پلوں میں تندرست ہوتا گیا، تم یقین کرنا کہ میری آنکھ رات کو لگ گئی مگر اُس نیک بخت نے پلک سے پلک نہ جھپکائی۔ پچھلے پہر جب میں اُٹھی ہوں تو بچّہ کی حالت میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ بخار بہت ہلکا تھا۔ ہوش درست حواس ٹھکانے۔ میں نے بچّہ کو گلے سے لگایا اور چاہتی تھی کہ محسنہ کے قدموں پہ گروں، آنکھوں سے لگاؤں یہ پاؤں۔ میں آگے بڑھی۔ بے اختیار ہو کر لپٹی، میرا دل کمزور، میری حالت خراب، اور میری طبیعت بیٹھی جاتی تھی، اس قدر روئی کہ ہچکی بندھ گئی اِس نیک بیگم نے مجھ کو چھاتی سے لگا لیا۔ میری کتھا سُنی اور کہا "شوہر کی ہو یا ساس کی خدمت میں فرق نہ آنے دینا اور یاد رکھنا کہ اطاعت کے بیج ایسے پھول بن کر مہکیں گے جن کو فنا نہیں۔" میں نے کہا "آپ کا کیا نام ہے؟" مسکرائیں اور کہا "تم کو اس سے کیا کام۔ اگر پھر کبھی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔ نسیمہ کا گھر پوچھ لینا،

اس نام کی شہرت تمام شہر میں تھی ہشت شدر رہ گئی، موذّن اذان دے رہا تھا۔
اُس نے بچّہ کو پیار کیا اور کہا " اچھا بیوی تمہارا بچّہ تم کو مُبارک ہو۔ خدا تمہاری
مامتا ٹھنڈی رکھے دعا کرنا کہ میرا بچھڑا ہوا لال بھی مجھ سے ملے۔"
اتنا کہہ کر نسیمہ بیگم آنکھ سے اوجھل ہو گئیں اس واقعہ کے بعد کوئی آفتاب
میرے سر پر ایسا طلوع نہ ہوا اور نہ کسی رات نے میرے سر پر ایسا سایہ ڈالا کہ اُس
کا خیال میرے دل سے فراموش ہوا ہو۔ میری ساس تھوڑے روز بعد دُنیا سے
رُخصت ہوئیں مگر میں نے آخر وقت تک اُن کی اطاعت میں فرق نہ آنے دیا۔ اُس
کا نتیجہ یہ تھا کہ وہی شوہر جو ماں کی زندگی میں کبھی سیدھے منہ بات نہ کرتا تھا۔
میرے مرض الموت میں پھُنیاں کھاتا تھا۔ نسیمہ بیگم کی خدمت سے میرا بچّہ موت کے
مُنہ سے چھٹا اور اُن کی نصیحت نے شوہر کو جیتے جی میرے قدموں میں ڈلوا دیا اور
مرنے کے بعد میرے صبر اور شکر کا یہ انعام مجھے ملا کہ اس جنت الفردوس میں
اپنے لئے کوئی خواہش نہیں میری التجا قبول ہو گی۔ یہ وقت نسیمہ بیگم کی پاک روح
اُس کے مبارک جسم سے جدا ہوتی ہے۔ دنیائے حیات کی لاتعداد ہستیاں
اُس کی زندگی سے مستفید ہوئیں۔ ضرورت ہے کہ عالمِ بالا کی تمام جنتی رُوحیں
اس وقت سجدے میں گر پڑیں اور درگاہِ ربُّ العزت میں گڑگڑا کر عرض کریں کہ
نسیمہ کی پاک روح جس وقت تن سے علیحدہ ہو تو وسیمہ جس کی صورت
کو ترستی، آواز کو پھڑکتی ہوئی ماں دنیا سے وداع ہوئی ہے کلیجہ سے چمٹ جائے۔"
فرشتہ موت کی تیوری پر بَل آ گیا اُس نے عورت کی روح کو جھڑک
دیا اور کہا۔
" تو مر کر بھی دُنیا کے جھگڑوں سے نہ چھوٹی۔ اور آج تک وہی خیال تیرے
دماغ میں چکّر لگا رہا ہے تجھ کو معلوم ہے یہ آخرت دنیا کی کھیتی ہے۔ یہاں ایک

ایک ذرّے کا عذاب ثواب ملتا ہے۔ جس عورت کا تو ذکر کرتی ہے وہ تیری سفارش اور عنایت کی محتاج نہیں۔ اُس نے اپنی زندگی میں خدا کی پوری رضامندی حاصل کی۔ موت اُس کی تکالیف کا خاتمہ اور فرحت کا آغاز ہے۔ تو کھڑی رہ اور دیکھ کہ اُس کی روح کا داخلہ قصرِ نسیمہ میں اِس طرح ہو گا کہ۔

نسیم اُس کی گود میں اور وسیم اُس کے ساتھ۔

(۳)

بزمِ طرب کی اُس شمع منوّر کی مانند جو رات کے آخری حصّہ میں جب حاضرین مجلس ایک ایک کر کے رُخصت ہوں اور یہ سامانِ عیش پھیکا پڑنا شروع ہو جائے جھلملا جھلملا کر صُحبتِ شب سے وِداع ہوتی ہے نسیمہ پر جس وقت مرض الموت کی بیہوشی طاری ہوئی اور دماغ نے یادِ وسیم کے سوا تمام تعلقات کو خیرباد کہا اور خیال کی تمام قوّت اُسی لال کی طرف ڈھل گئی جس کی تصویر کھاتے پیتے سوتے جاگتے آٹھوں پہر دن رات آنکھ کے سامنے رہتی تھی، تو کانوں نے شوہر کے آخری الفاظ سُنے اور زبان نے یہ جواب دے کر کہ "میرے لال کی روح میرے استقبال کو آئی" بتیس اکیس سال کے واسطہ کو جو بالآخر فنا ہونے والا تھا ختم کر دیا۔ اب اُن بیجوں کے پھل جو دُنیا میں بوئے اُن معاملات کے نتیجے جو تعلقات میں برتے، ان کاموں کے انجام جو زندگی میں کئے روبرو تھے۔ روح جس کی بدولت جسدِ خاکی اُچھل کُود رہا تھا رگ رگ سے وداع ہو رہی تھی۔ پنڈلی سے پنڈلی لپٹ رہی تھی۔ ہاتھ سے ہاتھ چمٹ رہا تھا اور موت جس کو زندگی بھول کر یاد نہیں کرتی اس مہین کپڑے کی طرح جو خاردار جھاڑی پر ڈال کر گھسیٹا جائے جسم سے جان نکال رہی تھی۔ کتنا نازک وقت تھا کہ بچّے جو ماں کے نام کے عاشق تھے معذور کھڑے اُس کا دَمِ واپسیں، شوہر جو

بیوی کی صورت کا پروانہ تھا مجبور بیٹھا اُس کی مفارقت ابدی دیکھ رہا تھا۔ گھر کا کونہ کونہ اور زندگی کا ذرہ ذرہ باآواز بلند صدا دے رہا تھا کہ گوارپنہ کی آزمائش اور سسرال کے امتحان کا نتیجہ آج برآمد ہوتا ہے۔ زندگی فنا ہوتے ہی کانٹوں پٹا میدان یا پھولوں بھری سیجیں پیش کر دے گی۔ اور یہ راحت ابدی یا مستقل عذاب دوسروں کے واسطے عبرت یا سبق بن کر چند لمحہ میں ختم ہو گا۔ پیشانی پر بل آئے اذیت کی آوازیں نکلیں مگر یہ عارضی تکلیف قطعِ تعلق کا اثر تھا۔ روح پرواز کرتے ہی دیکھتی کیا ہے کہ دونوں کلیجے کے ٹکڑے نسیم اور وسیم جن کے مکھڑوں کو آنکھیں ترس گئی تھیں اور جو سفید کفن میں لپیٹے پٹائے ماں کی آنکھوں سے رخصت ہوئے تھے جھلا جھل کے کپڑے پہنے ہشاش بشاش گردن جھکائے کھڑے ہیں۔ آنکھیں جن عورتوں کو تلاش کرتی تھیں۔ دل جن پیاروں کو ہر جگہ ڈھونڈھتا۔ جو آنکھوں کے سامنے جاندار سے بے جان ہو کر گہری گوروں میں سو چکے تھے۔ جن کی ہڈیاں تک گل کر خاک ہو چکی تھیں جن کی قبریں تک دھنس شر ہو گئی تھیں، اُن کا اس وقت نظر آنا موت کی پہلی کامیابی تھی!

ٹھٹکی اور گم سم کھڑی ہو گئی کہ ملک الموت نے کہا:۔

"خالق کے احکام کو سچے دل سے بجا لانے والی مخلوق تیرے لال موجود ہیں"۔ بے تاب ہو کر آگے بڑھی نسیم دوڑ کر ماں کے قدموں میں لپٹا اور وسیم نے اپنی گردن ماں کے سینہ سے لگا دی۔ دونوں کو کلیجہ سے لگا لیا۔ اور سجدے میں گر پڑی۔

اب فرشتۂ موت آسمان کی طرف اُڑا نسیمہ قدم قدم پر خدا کی رضامندی کے آثار پا رہی تھی۔ وہی در و دیوار جو قبل از رحلت اُس کی موت پر آٹھ آٹھ آنسو رو رہے تھے۔ اُس وقت مبارکباد میں سرگرم تھے۔ پھولوں نے اُس کی زندگی سراہی پتوں نے اُس کے اعمال سنائے۔ بلبل نے اُس کے کام پر وجد کئے۔ اور طوطی

نے اس کے نام کا کلمہ پڑھا چشم زدن میں یہ منظر ختم ہوا اور اب وہ وقت آیا کہ نسیمہ بیگم کی پاک روح خالق الموجودات کے حضور میں حاضر ہو۔ لطیف رُوح غسل کی محتاج نہ تھی۔ ایک نُور سامنے آئی۔ اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اور رضائے باری کا ایک بیش بہا جھومر اُس کے ماتھے پہ لگا اُلٹے قدموں پلٹ گئی۔ اب فرشتۂ موت جگمگاتی روح کو لیئے ہوئے دوسرے مقام پر پہنچا۔

یہاں حوروں کی صفیں قطار در قطار استقبال کو موجود تھیں۔ سب نے بالاتفاق خوش آمدید کا نعرہ لگایا۔ ایک ممتاز حُور سامنے آئی اور سر سے پاؤں تک ہیرے اور جواہرات کے زیور پہنانے شروع کیئے۔ وہ پہناتے وقت باواز بلند کہتی تھی کہ "یہ جڑاؤ گلو بند شوہر کی رضامندی کا صلہ ہے۔ اور ہیرے کے کنگن اس لیئے اِن ہاتھوں میں پہنائے جاتے ہیں کہ یہ اپنے جسم سے زیادہ مخلوق کے کام آئے۔ والدین کی فرمانبرداری، اور بزرگوں کی تعظیم کا انعام یہ موتیوں کی مالا ہے۔" حُور کے اِس اعلان پہ باقی ماندہ گروہ مُبارک، مُبارک کی صدائیں دیتا تھا، اور خاموش ہو جاتا تھا۔

(۴)

وسیم کی موت کے بعد اُس کی بیوی وسیم دُلہن کو اپنے ہاتھ سے دُلہن بنا کر حقیقی ماموں زاد بھائی عارف سے نکاح کر دینا حق یہ ہے کہ نسیمہ ہی جیسی نیک بی بی کا کام تھا۔ ہم جہاں تک اس معاملہ پر غور کرتے ہیں نسیمہ کا یہ انتخاب لاریب لاجواب تھا، عارف کی بیوی مری وسیم دلہن کا شوہر مرا۔ دو بچوں کا باپ وہ؛ دو بچوں کی ماں یہ۔ پانچ چھ سال بیوی والا وہ رہا، چھ ساڑھے چھ سال سہاگن یہ رہی، پوری جوڑ اور برابر کی ٹکر تھی۔ یہ مرنے والی نسیمہ کا رحم اور کرم تھا۔

اُس نے اپنے بچّوں کا بوجھ پرائے سر نہ ڈالا اور مہر کی پوری جائداد اپنے بچّوں کا
حق کاٹ کر بن باپ کے بچّوں کو دے دی۔ وہ اچھی طرح سمجھتی تھی، اور سمجھتی کیا تھی
کہہ دیا کھلے خزانے کہا اور علی الاعلان کہا۔ اُس وقت جب بہو کو پالکی میں
سوار کیا کہ جائداد اِن بچّوں کی پرورش کے واسطے ہے" مگر اُس کی ذمہ دار
وہ نہ ہم بلکہ خود مسلمانوں کی خدائی خوار قوم کی بادشاہ اور مزدور چشم بد دور
جو ہے وہ نورٌ علیٰ نور۔ عارف بے ایمان اگر ایمان سے کام لیتا تو وسیم دُلہن
اُس کے واسطے حور تھی۔ صورت میں شکل میں، عزت میں آبرو میں، روپیہ میں، پیسہ
میں۔ عارف کی کائنات ساٹھ روپیہ کی ملازمت، وسیم دُلہن رانڈ ہو کر بھی بیس ہزار
کا زیور اور پچپن ہزار کی جائداد رکھتی تھی کمبخت اگر خدا عقل دیتا تو ایسی بیوی کے
پاؤں دھو دھو کر پیتا۔ وسیم کے معصوم بچّے جن کو بدنصیب دادی مرتے مرتے
کلیجہ سے چمٹائے دُنیا سے رُخصت ہوئی۔ سوتیلے باپ کے گھر کی رونق اور خاندان کی
ناک تھے۔ نسیمہ کی آنکھ بند ہوتے ہی ظالم طوطے کی طرح دیدے بدل گیا نسیمہ
جنتی بیوی تھی۔ اپنی زندگی میں مٹے ہوئے اسلام کی شان دکھا گئی۔ اور نہ سمجھ سکی کہ
مسلمان سب گنوں پورے کوئی نہ کہو لنڈورے۔ بیوہ بہو کا خود نکاح کر دینا آسان
کام نہ تھا۔ دل پر جو گذری وہ اُسی کا دل جانتا ہوگا مگر خدا کے، اور رسول کے ارشاد
میں فرق نہ آنے دیا۔ لیکن ضرورت یہ تھی کہ بیوہ کے بچّے دادی کے پاس رہتے یا
نانی کے اور پھوپی کے یا خالہ کے اُس ماں کے پاس رہنا جو دوسرے شوہر کی بیوی
ہے کھلی ہوئی تباہی اور علانیہ بربادی تھی۔ تاہم، ہم اِس مصیبت کا ذمہ دار وسیم
دُلہن کو قرار دیں گے۔ نکاح کیا خوب کیا، درست کیا، بجا کیا کرنا چاہیئے اور ضرور
کرنا چاہیئے ساس کے اصرار سے، ماں کی مجبوری سے باپ کی زبردستی سے۔ الغرض
خوشی سے یا جبر سے مگر کرنی یا ہوتا اُس سے جو نام ہی کا مسلمان نہیں کام کا بھی ہو۔

دبدبے ہی کا نہیں عقیدے کا بھی۔ سب سے پہلا کام بچوں کا انتظام تھا کہ معصوموں کے سر پر باپ کا سایہ نہ رہا تھا۔ مگر باپ کو رونے والی ماں ابھی زندہ تھی۔ اُسی کی آگ تھی کہ پیٹ کے بچوں کا حق قربان کیا۔ اور اُن کی روٹی کا سہارا کر گئی۔ نگوڑی نہیں ناٹھی نہیں پورا کنبہ موجود تھا۔ بچے دودھ پیتے نہیں خاصے چار چھ برس کے تھے۔ اور چار پانچ برس آنکھ بند کر کے گذر جاتے۔ بیوی کے زیور کو تو عارف نے اوّل ہی دن سے اپنی ملکیت سمجھا۔ خیر یہاں تک چنداں مضائقہ نہیں مگر بچوں کی جائداد بھی حلوائے بے دود تھی اور شروع ہی سے اِس فکر میں تھا کہ کسی طرح یہ ہتھیاؤں بظاہر اُن کا دیوانہ تھا اور بیوی کے دل میں گھر کرنے کی اس سے بہتر تدبیر اور کیا ہو سکتی تھی۔ نکاح کے پہلے ہی سال، کئی موقعوں پر، کوشش کی کسی ترکیب سے یہ جھگڑا پاک کرے، مگر ادھر نسیمہ کی زندگی سر پہ پورا انکس تھی۔ اُدھر خود بھی کچھ ہمت نہ پڑتی تھی۔ اور سب سے بڑی بات وسیم دُلہن کی نیت تھی۔ دُنیا آخرت کی کھیتی ضرور مگر یہاں کے بیج یہاں بھی پھل لے آتے ہیں۔ اگر بن باپ کے بچے عارف کے گھر میں موجود تھے تو بن ماں کے بچے وسیم دُلہن کے سپرد بھی۔ چاہئے تھا کہ ماں بن کے آئی تھی ماں بن کر رہتی۔ اور ماں کی محبت ننھے ننھے دلوں سے بھلا دیتی۔ اور دکھا دیتی کہ سوتیلی مائیں پرائے پیٹ کے بچوں کو ماں سے زیادہ سمجھتی ہیں جب تک اُس کی نظریں محبت اور رحم سے بھری اُن بچوں پر پڑیں خدا اُس کے بچوں کا نگہبان رہا مگر جب نفسانیت نے محبت کو عداوت اور چاہ کو سوتیا ڈاہ بنا دیا، غریب بچوں کے پیلے پڑنے اور پھٹے پرانے پہننے لگے، تو خدا کا غضب مصیبت بن کر ایسا نازل ہوا کہ کلیجہ مسوس کر رہ گئی۔ بات صرف اتنی تھی کہ عارف کا چھوٹا لڑکا فاروق چھری ہاتھ میں لئے کھڑا تھا۔ سلیم وسیم کا لڑکا دیکھ کر مچلا اور لوٹنے لگا کہ چھری لوں گا۔ چھری عارف کی بھی نہیں، فاروق کی مری ہوئی ماں کی تھی۔ سلیم کی ضد دیکھ کر وسیم

دلہن آپے سے باہر ہو گئی اور فاروق سے بگڑ کر کہا : دے کیوں نہیں دیتا اندھا ہے۔ دیکھ نہیں رہا بچہ زمین میں لوٹ رہا ہے۔ " اپنا پوت دوسرے کا ڈھینگرا۔ یہ مثل اُس وقت اصل تھی۔ بمشکل سے فاروق تین چار مہینے سلیم سے بڑا ہوگا۔ مگر وسیم دلہن کی رائے میں اپنا بچہ بچہ تھا اور وہ بوڑھا۔ فاروق یہ صحیح ہے کہ زندہ باپ کا بے وارث بچہ تھا اور اُس کو حق نہ تھا کہ سوتیلی ماں کی دہلیز پر عدول حکمی کرتا۔ مگر بچہ تھا نہ سمجھ سکا کہ بدنصیب ماں کی شفقت سے محروم ہے۔ اور مرنے والی کی موت بچپن کی تمام ضدیں ختم کر گئی۔ مُنہ پھلا کر کھڑا ہو گیا اور چھُری کا پلڑا مٹھی میں بھینچ کر کھڑا تھا کہ ڈائن ناگن کی طرح پھنپھناتی اُٹھی اور مُنہ پر ایک تھپڑ دے دستہ اس زور سے کھینچا کہ چھُری معصوم کی چاروں انگلیاں لہو لہان کرتی باہر نکلی۔ بچے ناسمجھ ہوں یا بھولے اور ضدی ہوں یا نیلی نگران کی ہر شرارت کی وجہ اور ضد کا سبب صرف ناز برداری ہوتی ہے۔ کسی لاڈلے بچے کے ٹھیڑ تو کیا پھانس لگ جاتی تو قیامت برپا کر دیتا۔ مگر فاروق لاکھ بچہ تھا لیکن فطرت اُس کو سمجھا رہی تھی اور واقعات بتا رہے تھے کہ پسینہ پر خون گرانیوالی قبر میں جا سوئی۔ اور اب کوئی خون پر بھی افسوس کرنے والا نہیں۔ اس نے پہلے اپنے ہاتھ کو دیکھا کہ خون دھل دھل بہہ رہا ہے اور اس کے بعد سوتیلی ماں کو۔ مگر بچہ ہم کو وہم ہو گیا۔ جب یہ دیکھا کہ میری انگلیوں سے زیادہ اِس قصائی کی آنکھوں سے خون ٹپک رہا ہے۔ اپنی تکلیف بھُول خون بھری انگلیوں سے ہاتھ جوڑ کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

" اچھی اب نہیں۔ "

فاروق کا بڑا بھائی صدیق جو اُس سے ڈیڑھ برس بڑا تھا سوتیلی ماں کے غصہ سے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ جب وہ سامنے سے ہٹ گئی تو بھائی کا خون

دیکھ کر خون کے جوش نے بیتاب کر دیا۔ اُس کا ہاتھ پکڑ کر باہر لے گیا۔ ہر چند ہاتھ
ڈھلایا مگر زخم کاری تھا خون نہ تھما۔ دونوں بدنصیب گلی میں بیٹھے حسرت سے
ایک دوسرے کی صورت کو تک رہے تھے کہ وسیم دُلہن کی آواز کان میں پہونچی
دبے دبے پاؤں ڈرتی ہوئی صورت اور بھولی آنکھوں سے اندر آئے عارف کے
آنے کا وقت تھا اس خیال سے کہ خبر نہ ہو جائے دونوں کو باورچی خانہ میں بٹھا کر
حکم دے دیا کہ " اگر یہاں سے ہلے تو کھال اُڑا دوں گی "
بھول گئی یا جان کر خدا جانے یا وہ جاڑے کڑکڑاتے جاڑے اور چلّے کی سردی
میں وسیم دُلہن اُس کے بچے، عارف سب گرم بچھونوں میں بے خبر سوتے تھے اور
بن ماں کے دو بچے باورچی خانے میں شُوں شُوں کرتے اکڑ رہے تھے!
وسیم دُلہن کی یہ سنگ دلی ایسی نہ تھی کہ خدا کا غضب جوش میں نہ آتا اور
فاروق کا حقیقی وارث معصوم کی حمایت کو نہ اُٹھتا۔ بہتری اور بدتری دونوں
حالتوں کا انحصار اسباب پر ہے۔ عارف کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آسکتی
تھی کہ ایک معمولی ساٹھ روپے کا اہلکار چالیس پچاس ہزار کی مالیت پر قابض اور
وسیم کی بیوی کا مالک ہوگا۔ وسیم دُلہن اُس کے واسطے نعمت غیر مترقبہ تھی۔ اُس نے
ابتدا میں بیوی کی جو قدر و منزلت اور اُلفت و محبت کی اُس میں صرف ایک
سجدہ باقی تھا۔ وسیم دلہن اگر سمجھ دار ہوتی تو اس محبت کو ترقی دیتی۔ اِس تعلق
کو مستحکم کرتی اور اس فریفتگی کو استوار کرتی مگر تقدیر دوسرے سامان پیدا کر رہی
تھی۔ میاں کی محبت پر بھول گئی۔ اِس تغافل کا نتیجہ یہ ہوا کہ عارف کو بیوی سے جو
توقعات تھیں وہ پوری نہ ہو سکیں۔ لاکھ ایک چھوڑ دو دو مامائیں آگے موجود تھیں مگر اس
کا مطلب یہ نہ تھا کہ خانہ داری کا انتظام ماماؤں کے سپرد ہوا اور بیوی دن رات
پلنگ پر اینڈتی اور آئینہ کے آگے مٹکتی رہے۔ بارہ مہینے کی بیمار تیس دن کی روگی۔

ہم تسلیم کر لیتے ہیں کہ وسیم دُلہن بچی تھی مگر سوچتی اور سمجھتی کہ عارف انسان ہے فرشتہ نہیں۔ بیمار تھی تو نادم ہوتی، مجبور تھی تو اعتراف کرتی: یہ کیا کام کے قابل نہیں، انتظام کے لایق نہیں۔ شوہر بھوکا پیاسا لق لق کرتا دفتر جا اور آ رہا ہے۔ ماماؤں نے جیسا چاہا اور جیسا ہو سکا بھون جھُلس آگے رکھ دیا۔ کبھی نمک زہر اور مرچیں ہلاہل اور بیمار بیوی بجائے افسوس کے زبان سے کچوکے اور طعنوں کے چرکے دیئے چلی جا رہی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا اور ہونا چاہیے تھا کہ ایک دو ہی سال کے اندر عارف نے اور نکاح کر لیا۔ یہ عقلمندی بھی وسیم دُلہن ہی کی تھی۔ معلانی کی جوان لڑکی گھر میں موجود تھی۔ بیوی نے میاں کے کھانے پینے کپڑے لتے کا تمام کام اُس کے سُپرد کیا، انجام جو ہونا تھا وہ ہوا، اب البتہ وسیم دُلہن کی آنکھیں کھلیں۔ مگر بے سُود۔ اب پچھتائے کیا ہوت ہے۔ جب چڑیاں چُگ گئیں کھیت۔ مرض ختم بیماری رفو چکر اور لا پروائی ہوا ہوئی۔ ہوش آیا مگر بے وقت، سمجھ آئی مگر دیر میں یہ وہ وقت تھا کہ ہاتھ ٹکنے والی۔ ہاتھ باندھنے والی، ہاتھ جوڑنے والی نسترن برابر کی سوکن تھی۔ وسیم دُلہن اُس کا رنگ دیکھ دِل ہی دل میں بھُنتی، انگاروں پر لوٹتی مگر اُس کا خدا اُس کے ساتھ تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ دولت دیکھ کر ابھری نہیں اور بیوی بن کر بگڑی نہیں۔ دب کر رہی اور گر کر ملی۔ کم حیثیت تھی تو ہو۔ راجہ کے گھر آئی رانی کہلائی۔ جو کام کیا پورا کیا جو فرض تھا وہ ادا کیا۔ بیوی بن کر آئی اور لونڈی بن کر رہی۔ خدمت میں کمی نہ کی اطاعت سے مُنہ نہ موڑا۔ محبت میں کسر نہ کی۔ خدمت میں دقیقہ نہ چھوڑا۔ ضرورت سے زیادہ آسائش توقع سے بڑھ کر آرام اور اُمید سے سوا خوشی پہنچائی انجام روشن نتیجہ ظاہر اور معاوضہ صاف تھا۔ عارف ایک سال ہی بھر میں نسترن کا کلمہ پڑھنے لگا۔ خدا کی شان تھی وہی وسیم دلہن جو عارف سے سیدھے مُنہ بات نہ کرتی

تھی آج گھنٹوں رستہ میں کھڑی رہتی۔ وہ آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا کئی دفعہ ارادہ کیا کہ پرچہ لکھ کر دوں مگر اتنا موقعہ بھی نہ ملا نسترن کے اختیارات روز بروز وسیع تھے۔ جس کو چاہا چاہے وہی سہاگن۔ کُل کلاں مختار وہی تھی۔ یہ وہ وقت تھا کہ وسیم دُلہن کو جو کچھ نسترن ہاتھ اُٹھا کر دیتی وہ کھا لیتی۔ جو پہنا دیتی وہ پہن لیتی۔ یہ جو کچھ بھی تھا بدبخت کے اپنے کوتکوں کا نتیجہ اور کرتوں کا پھل، ابھی تک قدرت نے اس کو اپنی طرف سے کوئی سزا نہ دی۔

ماں کی بدولت دونوں بچوں کی مٹی پلید ہو رہی تھی۔ عارف جو بیوی کی محبت کے زمانہ میں ہمیشہ سوچتا رہا کہ کسی طرح ان کا مال ہتھیاؤں۔ اب کہ بیوی کے نام سے نفرت تھی بچوں کا جیا بھی دشمن ہونا کم تھا۔ دو دفعہ کوشش کی کہ دونوں کا خاتمہ کر دوں۔ مگر دونوں دفعہ ناکام رہا۔ سات سال آنکھ بند کر کے گذر گئے۔ مگر افکار کی متواتر بھرمار سے وسیم دلہن کا اب صرف ایک ڈھانچ باقی تھا جو کسی وقت سر سے پاؤں تک گوندنی کی طرح زیور میں لدی تھی۔ اب اُس کے پاس چاندی یا تانبے کا تار تک نہ تھا میلے چکٹ کپڑے۔ لونڈیوں کی طرح دن رات ایک کونہ میں پڑی رہتی تھی۔ سوکن اُس کی چھاتی پر مونگ دلتی۔ عارف اُس کے سامنے ٹھٹھے لگاتا۔ میاں بیوی اُس کے روبرو ہنستے بولتے کلیجہ پر سانپ لوٹتا، دل میں ہوک اُٹھتی، طبیعت میں جوش آتا۔ مگر سانپ کی طرح سر دُھنتی اور چپ ہو جاتی ہُوک اُڑ گئی۔ نیند جاتی رہی۔ راتیں اسی جھگڑے میں صبح اور دن اسی پیچ و تاب میں ختم ہو جاتے۔ اس وقت نسترن بھی دو لڑکوں کی ماں تھی اور گو عارف اور وسیم دلہن دونوں کے بچے موجود تھے۔ مگر جو شرافت اور انسانیت ان دونوں کے چہروں پر تھی وہ ان چار میں ایک کے بھی نہ تھی۔

باپ کے بعد وسیم کے بچے جب تک دادی کی چوکھٹ پر رہے۔ یا دادی زندہ

رہی لالوں کے لال بچے۔ نسیمہ کے فرشتوں کو خبر نہ تھی کہ یہ تقدیر پھوٹی بہوا پنے کوتکوں سے خود ہی نہیں، بچوں تک کو برباد کر دے گی۔ اب بیوی سے لونڈی، بیگم سے کنیز اور گھر والی سے باندی بن چکی تھی۔ نفس کی شرارت اور دل کی خباثت اِس وقت بھی باز نہ آئی۔ زیور کا بڑا حصہ پیروں اور مُلّاؤں کی نذر ہوا اور صرف اِس اُمید پر کہ کسی طرح سوکن اور اُس کے بچے زندہ نہ رہیں۔ دیوالی دسہرہ کی پونجیاں تو مستقل تھیں ہی یوں بھی کوئی دن اس کوشش سے خالی نہ جاتا۔ سوکن رذیل تھی یا ذلیل مگر اپنی آنکھ سے دیکھتی کہ آج سیندور لپٹی کلیجی، کل سوئیوں بھری سری انگنائی میں سے نکل رہی ہے مگر ہنس دیتی اور ٹال دیتی۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ وسیم دُلہن کی عقل میں فتور آگیا تھا۔ مگر اس میں کلام نہیں کہ بعض دفعہ اسی چکر میں ایسی سخت غلطیاں کر بیٹھتی تھی کہ تعجب ہوتا تھا۔ بھلا یہ بھی کوئی بات تھی کہ نسترن کے بڑے لڑکے ظہیر کی گیند گھر میں آ پڑی گھنٹہ بھر تک دروازہ پر کھڑا دہ سر پٹکتا رہا۔ چپکی بیٹھی سنتی رہی۔ اور کنڈی نہ کھولی۔ خواہش تو عارف کے دل میں بھی یہ موجود تھی کہ کسی طرح وسیم کے بچوں کا مال اُڑاؤں مگر اس کی اور وسیم دُلہن کی خواہش میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ متمنی تھا مال کا اور یہ ساعی تھی موت کی۔ پھر ایک کیا نہیں تین کی عارف بدنصیب بیوی کی اِس خواہش اور کوشش دونوں سے واقف تھا۔ کئی دفعہ قصد کیا کہ سزا دے مگر واہ ری نسترن کہنے کو تو مخلاتی کی لڑکی تھی، کمین کہو یا نیچ ذات مگر شریف زادیوں کو مات کیا۔ ہمیشہ روکا اور سدا سمجھایا۔ لیکن عارف کے علاوہ ایک اور طاقت بھی تھی جو وسیم دُلہن کے اعمال کو اچھی طرح پرکھ رہی تھی اور جو کسی صلاح یا مشورے کی محتاج نہ تھی۔

وسیم دُلہن کا بڑا لڑکا اسلام جو ماں کی کوششوں میں برابر کا نہیں شریک غالب تھا اور اس کی اخلاقی حالت بدبخت ماں کے ہاتھوں اتنی غارت اور برباد

ہو چکی تھی، کہ اُٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے ہر وقت اِسی اُدھیڑ بُن میں غرق رہتا تھا کہ کوئی تعویذ کوئی گنڈا، کوئی فلیتہ، کوئی داؤں کوئی ترکیب، کوئی کوشش، کوئی موقعہ، کوئی صورت ایسی ہو اور ایسا ہو کہ فاروق اور صدیق۔ نسترن اور اُس کے دونوں بچے ٹھکانے لگائیں اور سارے گھر کی حکومت ماں کے قبضہ میں آجائے خدا کی شان تھی کہ نسترن کے دونوں بچے کڑکڑاتے جاڑوں میں نماز صبح کے وقت بستہ بغل میں لئے پڑھنے جائیں اور وسیم کا بچہ چودہ پندرہ برس کا ڈھو کسی کامل فقیر کی تلاش میں سرگرداں رہے! یہ درست کہ وسیم دُلہن کی تقدیر پلٹا کھا چکی تھی مگر سوچتی اور سمجھتی کہ عمر ڈھل چکی بڑا حصہ ختم ہوا۔ یہ دو بچے مرنے والے شوہر کی یادگار اور عزیز ساس کی امانت ہیں۔ اُن کی زندگیاں برباد نہ ہوں۔ خُدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اُس دادی کو جو بدنصیب بچوں کی روٹی کا سہارا چھوڑ مری اور جانور ماں اُن کی تعلیم پر توجہ کرتی تو لالوں کے لال تھے۔ مگر کمبخت نے بھول کر بھی دھیان نہ کیا۔ آپ بھی دن بھر اِسی اُدھیڑ بُن میں لگی رہتی اور بچے بھی دن بھر پیر فقیر کی تلاش میں مارے مارے پھرتے۔ شہر میں دفعتاً یہ خبر مشہور ہوئی کہ ایک ولی کامل جمنا کی درگاہ میں آکر ٹھیرے ہیں۔ کھانا پینا سب چھوڑ دیا۔ صرف رات کے وقت آبخورہ کچے دودھ کا پی کر گزارہ کرتے ہیں۔ مگر کسی کی مجال نہیں کہ وہاں تک جاسکے۔ بات چیت مطلق نہیں کرتے۔ اسلام اِس موقع پر کیا چوکنے والا تھا۔ سُنتے ہی پہنچا۔ دیکھتا ہے تو واقعی آدمیوں کا تانتا لگا ہوا ہے۔ مگر حضور تک کسی کی رسائی نہیں۔ پندرہ بیس مسٹنڈے بڑی بڑی زلفیں نیچے نیچے کرتے۔ ہاتھ باندھے گردنیں جُھکائے خاموش پہرہ دے رہے ہیں۔ ایک ہفتہ بھر کی متواتر ریاضت اور لگاتار محنت کے بعد باریابی ہوئی۔ کامیابی شاہ صاحب کی زبان میں تھی۔ اینٹھا جو اینٹھتا تھا گھیٹا جو گھیٹتا تھا۔ خلقت پروانوں کی

طرح پیرجی پر گری اور اُس بھلے مانس نے بھی تاک تاک کے ایک ایک کو موسا۔ اسلام اب اکثر شاہ صاحب کی اردلی میں رہتا۔ بارہ ایک بجے رات کو آیا اور پڑرہا صبح نماز کے وقت پھر جا پہنچا۔ طبابت فقیری کا شاید کوئی جزو ہے کہ پیر حکیم بھی ہوتے ہیں۔ ہمارے شاہ صاحب روحانی ہی نہیں جسمانی طبیب بھی تھے۔ صبح کے وقت ایک شخص ایک لڑکی کو گود میں لئے حاضر ہوا۔ اور عرض کیا کہ "آج سات روز سے بخار میں جُھلس رہی ہے۔ دنیا بھر کے جتن کر ڈالے بخار ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ کمزوری کا یہ حال ہے کہ آواز نہیں نکلتی۔" شاہ صاحب نے غور سے دیکھا۔ اور فرمایا۔ "گلا آگیا ہے گلا" اتنا فرما کر ایک مرید کی طرف اشارہ کیا۔ وہ فوراً لڑکی کو گود میں لے باہر آیا۔ اور ایک سفید رومال گلے میں ڈال گلا اُٹھانے لگا۔ بچی بخار میں نوہل ہلا ہی رہی تھی۔ رومال میں تھی کانٹھ نہ معلوم کس رگ پر پڑی کہ بچی باتوں ہی باتوں میں ٹھنڈی ہوگئی۔ شاہ صاحب کی اِس بیہودگی اور لوٹ کھسوٹ کا شہرہ دُور دُور پہنچ رہا تھا۔ مگر خلقت اب بھی بات کی تہہ کو نہ پہنچی دوپہر کے وقت ایک ہندوسیٹھانی تین برس کا بچہ لئے ہوئے آئی اور کہا۔ "ڈاڑھ میں کیڑا لگ گیا۔ انگریزی اور یونانی دونوں علاج کر چکی کہ ایک چیخ زمین میں ہے اور ایک آسمان۔" بچہ زیور میں لدر ہا تھا۔ ایک شاہ صاحب کیا جماعت کے مُنہ میں دیکھتے ہی پانی بھر آیا۔ اشارہ ہلتے ہی ایک مُرید آگے بڑھا اور بچے کو لے دوسرے کمرے میں پہنچ کھٹ کیلیا کے بیج جو دانتوں کے کیڑے کے واسطے مشہور ہیں ایک ہنڈیا میں ڈال اوپر سے آگ ڈال دی شاہ صاحب ہشیار تھے یا اُلو مگر مُرید اُلو بھی نہیں اُلو کا پٹھا تھا کہ بچہ کا سر زبردستی ہنڈیا میں ٹھونسا اور کہا دھوئیں سے کیڑے مریں گے ہنڈیا چھوٹی سر بڑا گردن پھنس گئی۔ ہوا کا راستہ نہیں رہا۔ دھوئیں سے دم گھٹا ہر چند غریب۔ ہاتھ پاؤں مار رہا ہے مگر گردن نہیں نکلتی۔ اور مرید صاحب

اُوپر سے زبردستی گردن پکڑے مسکنے نہیں دیتے۔ دم نکلنا تھا نکل گیا۔ مگر گردن ہنڈیا سے نہ نکلی۔ آدھ گھنٹہ سے زیادہ گذر گیا ہیچ خاک آگ ٹھنڈی اور دھواں ختم ہوا۔ مریدِ صاحب بہت سٹ پٹائے ہنڈیا توڑی تو بچہ کبھی کا اچھا ہو چکا تھا۔

ظالموں کو اُس وقت زیور کی پڑی تھی۔ ماں کھڑی رو پیٹ رہی تھی اور وہ سنگ دل زیور کی ٹٹول میں۔ آنکھ بچا کر کڑے تیر کئے اور چُپ ہو گئے۔ دونوں وارداتوں کی خبر پولیس کو پہنچی۔ شاہ صاحب کی غارت گری کا شہرہ تو مدت سے تھا! اِن خبروں سے باوجودیکہ کوتوال شریف النفس تھا ضبط نہ کر سکا۔ تلاشی لیتا ہے تو شہر بھر کی چوری کا مال موجود۔

(۵)

نسترن کی چچا زاد بہن عائشہ ایک درزی سے بیاہی گئی تھی۔ وہ میاں بیوی اور دو بچے مزے سے رہتے سہتے تھے اتفاق سے شہر میں ہیضہ پھوٹا اور اس شدت اور کثرت سے کہ گھر کے گھر صاف ہو گئے۔ ہر گھر سے رونے کی آوازیں بلند تھیں۔ چاروں طرف ایک کہرام مچا ہوا تھا۔ کیسے کیسے کڑیل جوان دیکھنے دکھانے کے لائق دو دو تین تین گھنٹہ میں چٹ پٹ ہو گئے۔ دنیا کیا قہرِ خدا تھا، جو ہیضہ کی صورت میں نازل ہو رہا تھا۔ وہ بھیانک لاشیں نکلتی تھیں کہ دیکھنے والے لرز جاتے عائشہ تھی تو جوان اور نوجوان بھی کیا لڑکی۔ نسترن سے چھ سات مہینہ چھوٹی مگر آنکھوں کی مریض بچپن سے تھی۔ کسی مکّار نے ہیرا کہہ کر کتیرا دے دیا۔ دونوں آنکھیں چوپٹ ہو گئیں۔ درزی غریب معصوم بچّوں کے ساتھ اندھی بیوی کو پال رہا تھا۔ شام کے وقت دوکان بند کر آٹا دال گھی ایندھن لے گھر آیا، آٹا گوندھا، دال چڑھائی روٹی ڈال بچّہ کو دی۔ بیوی کو کھلائی آپ لے کر بیٹھا تھا کہ قے ہوئی۔ ایک ہوئی

دو ہوئیں۔ تین ہوئیں۔ آنکھیں بند ہو گئیں۔ دست شروع ہوئے صبح تک تمام بدن اولا تھا۔ جب زندگی کی کوئی اُمید نہ رہی اور تشنج شروع ہو گیا۔ تو بیوی کو اپنے پاس بلا کر کہا۔

"میں اب گھڑی آدھ گھڑی کا مہمان ہوں، بچے تمہارے اور تم خدا کے سپرد ہو میرا کہا سنا معاف کرنا۔"

اتنا کہہ کر درزی رخصت ہوا۔ عائشہ آنکھوں سے معذور تھی۔ ہاتھ ٹٹولا تو نبض تھی نہ سانس، دن ایسے کہ سب کی جان ست ہی ست پر تھی۔ حالت یہ کہ گھر میں تانبے کا برتن نہیں۔ محلّہ والوں نے مِل جُل کر مرنے والے کا گور گڑھا کیا ہم اہلِ محلّہ کی ہمدردی ضرور قابلِ شکریہ خیال کرتے ہیں لیکن ایسے گھر میں جہاں دو ٹوٹی کھٹیوں کے سوا خاک نہ تھا۔ ہیضہ جیسے متعدّی مرض کی موت کے بعد خاموش ہو جانا یقیناً اسلام کی شان نہ تھی۔ مناسب تھا کہ اندھی ماں اور معصوم بچّوں کو نہلا دُھلا کر اُجلے کپڑے پہنا اس مکان سے علیحدہ کر دیتے۔ مگر کون کرتا۔ شام کو بڑے بچّے نے ہیضہ کیا۔ آنکھوں والی ماؤں کا اضطراب ایسے موقع پر جب دل تڑپتا اور کلیجہ مچلتا ہے صورت دیکھ کر کم ہو جاتا ہے۔ بے تابی میں تسکین اور نا اُمیدی میں اُمید کی جھلک دکھائی دیتی ہے مگر عائشہ کو اس یقین کے سوا کہ پانچ برس کی کمائی خاک میں مل رہی ہے۔ کوئی اُمید تھی نہ ہوش یقین کے ساتھ ہی وہ بچّے سے لپٹ گئی۔ اور اس وقت تک لپٹی رہی جب تک لوگوں نے نہلانے کے واسطے علیحدہ نہ کیا!

اب اس گھر میں صرف عائشہ اور اس کا ایک سات مہینے کا دودھ پیتا بچّہ تھا۔ آنکھوں کے صدمہ نے عائشہ کی جان پر بنا دی تھی۔ شوہر کی موت نے رہی سہی کمر توڑ دی۔ اور جب پانچ برس کا لال بھری گود خالی کر گیا تو عائشہ انسان نہیں ایک

منّی کا کھاد نا تھا۔ جو قدرت کے اشاروں پر چل رہا تھا۔ بچّہ کے میلے کپڑے ہاتھ میں ہوتے۔ مُنہ پر رکھ کر سونگھتی اور بلبلاتی۔ بیٹھے بیٹھے ایک ہوک اُٹھتی کھڑی ہو جاتی۔ کپڑے پھاڑتی اور ٹکریں مارتی۔ آدھی رات کا وقت تھا ہوا درست ہو چکی تھی۔ بیماری اِکا دُکا رہ گئی تھی اور خلقت کو بہت اطمینان ہو گیا تھا کہ عائشہ نے ہیضہ کیا۔ کرنا تعجب نہیں نہ کرنا تعجب انگیز تھا۔ کہ گھنٹوں مُردے کو لپٹی رہی۔ ہیضہ ہونا چاہئے تھا۔ دوا کیسی اور ٹھنڈائی کس کی۔ باپ بیٹے کی خبرِ موت تو عائشہ پہنچانے والی موجود تھی کہ دونوں اوّل منزل ہو گئے۔ اس کی خبر دینے والا صرف ایک شیر خوار بچّہ بلکتا تھا۔ ہوا نے معصوم بچے کی آواز دُور دُور پہنچانے کی کوشش کی مگر دُنیا بے فکر ہو کر نرم گرم بچھونوں پر پڑی تھی، کون اپنی نیند برباد کرتا۔ انجام جو باپ بیٹوں کا ہوا وہی اندھی عائشہ کا۔

عائشہ کا مردہ بے گور و کفن ایک دن اور ایک رات مسلمانوں کے پڑوس میں پڑا رہا۔ رات کے دس بجے ہوں گے کہ نسترن کو عائشہ کی بیوگی۔ اور بچہ کی موت کا علم ہوا۔ اِس وقت ہمارے سامنے وہ موقعہ ہے کہ ہارون الرشید بہلول دانا سے ملتجی ہے کہ کچھ نصیحت فرمائیے۔ بہلول خاموش ہیں اور ہارون مُصر۔ جب بہت منّت کی تو مسکرائے اور فرمایا:۔

" ہارون! مال اور جمال یہ دونوں دے کر خدا اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ سلطنت سے آج خوش ہو جا مگر کل یہ کمبخت بڑی مصیبت سر پر لانے والی ہے۔"

نسترن معمولی مغلانی کی لڑکی تھی جس نے آنکھ کھول کر سلائی کی روٹی کھائی اور خیرات کے کپڑے پہنے۔ مگر آج عارف کے گھر بار اور عارف ہی کے کیا سچ پوچھو تو عارف اور عارف کے بچوں اور ایمان سے کہو تو عارف عارف کے بچے وسیم دلہن اور اُس کے بچے سب کی مالک وہی تھی۔ دستور دنیا کے موافق جتنا اکڑتی اور جتنا

پھیلتی سجی تھی. بیبر کی ہنڈیا میں سوا سیر پڑا جو کرتی جائز تھا. مگر حیرت ہوتی ہے کہ وہ پتہ اور نیہا جو کنوار پنہ میں موجود تھا نکاح ہوتے ہی خاک میں مل گیا. عارف تو خیر سرتاج تھا. جو بھی کرتی حق رکھتا تھا. اُس کے بچوں تک کے آگے ہاتھ جوڑتی اور کھانے کھلاتی اور پھر یہ نہیں کہ دُنیا دکھاوے یا میاں کو خوش کرنے کو، گھر میں سوا بچوں کے اور کوئی نہیں اور وہ اللہ کی بندی پاس بٹھا کر چُمکار رہی ہے. مِنّت کر رہی ہے، خوشامد کر رہی ہے اور کھانا کھلا رہی ہے. بچوں سے آگے بڑھ کر وسیم دُلہن گو سوکن تھی اور کیسی سوکن جان کی دشمن اور خون کی پیاسی مگر پہلے اُس کو اور اُس کے بچوں کو کھانا بھیجتا اور پھر اپنے مُنہ میں ڈالتا. عائشہ کے شوہر اور بچہ کی خبر جس وقت پہنچی سونے کی تیاری کر رہی تھی. سُنتے ہی بے چین ہو گئی. اور ڈولی منگوا کر چلنے کو تیار ہوئی. ہم عارف کی طبیعت اور اُس کی نیت اور اس کی عادت سے واقف ہیں. اُس کا منشا ہرگز نہ تھا کہ بیوی وہاں جائے. مگر وہ خود بھی بیوی کی طبیعت سے اچھی طرح واقف تھا. کھُلم کھُلا تو نہیں ہاں دبی زبان سے اُس وقت کا جانا اُس نے پسند نہ کیا. وہ اگر صاف کہہ دیتا تو نسترن یقیناً نہ جاتی. مگر خود اُسی نے چبا کر کہا. اس لئے نسترن نے سنجیدگی سے عرض کیا "سرکار خدا آپ کے سامنے مجھے زمین کا پیوند کرے مگر یہ حالت میری رہنے والی نہیں. مجھے کچھ وہاں کی کمائی بھی کر لینے دیجئے. کام کا وقت یہی ہے جس نے مجھ کو یہ دن دکھایا ایک روز مجھے بھی اُسے اپنا مُنہ دکھانا ہے."

عارف بیوی کی اِس گفتگو سے بہت خوش ہوا اور اجازت دی تو وہ ایک ماما کو ساتھ لے وہاں پہنچی. اندر جا کر دیکھتی ہے تو وہ منظر تھا کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے. سات آٹھ مہینے کا زندہ بچہ مردہ ماں کی چھاتی پر لیٹا دودھ پی رہا تھا اور جب دودھ نہ نکلتا تھا تو وہ چیخیں مارتا تھا! سترہ اٹھارہ گھنٹے کا بھوکا رونے روتے

اور چیختے چیختے آواز بیٹھ چکی تھی۔ ہونٹوں پر پپڑیاں بندھی ہوئی تھیں اور معصوم چند گھنٹوں ہی کا مہمان تھا۔ اُس وقت جو کام نسترن نے کیا قدرت اُس کے احسان کا اعتراف ہمیشہ کرے گی۔ اُس نے ماما سے فوراً پانی گرم کروا بچہ کو نہلا گود میں لے اپنا دودھ اس کے مُنہ میں دے دیا۔ یہ وقت تھا کہ کیا آسمان کیا زمین کائنات کا ہر ذرہ اُس کی تعریف کر رہا تھا۔ مُردے کو غُسل وکفن دے قبرستان پہنچا اور بچّہ کو لے گھر پہنچی۔ عارف کی مجبوری پر پیل بھی آیا مگر اُس نے کہہ دیا کہ "جو خدا چھ بچّوں کو دیتا ہے وہ ساتوں کو بھی دے گا۔"

عارف ساٹھ روپے کا معمولی ملازم تھا اتفاق دیکھئے کہ کلکٹر صاحب کو ایک شخص کی دورے پر ضرورت ہوئی۔ عارف کا انتخاب ہوا۔ وقت کی بات تھی صاحب اس قدر خوش ہوئے کہ اُسی سال تحصیلداری کے لئے نامزد کر دیا اور ایک تین ہی مہینے میں شہر کے شہر میں وہ عارف جس کو پانچ روپیہ کی ترقی کے بھی لالے تھے ڈیڑھ سو روپیہ کا تحصیلدار تھا۔

ہمارا عقیدہ سچا اور یقین سچا کہ عارف کی اس غیر معمولی ترقی کی وجہ جو اس کے کیا کسی کے بھی وہم وگمان میں نہ آسکتی تھی محض نسترن تھی۔ اس نے دکھا دیا کہ نیک بیویاں کس طرح شوہروں کو زمین سے آسمان پر پہنچا سکتی ہیں۔ تحصیلداری کی پہلی تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی اُس نے ایک جلسہ منعقد کیا۔ اور اعلان کر دیا کہ شہر کے تمام اپاہج ومحتاج رات کا کھانا یہیں کھائیں۔ اسی سلسلہ میں لگے ہاتھ چھوٹے بچّے کی بسم اللہ کر دی۔

رات کے دس بجے جب وعظ ختم ہو چکا اور نسترن کے دونوں بچّے زرق برق پوشاکیں پہنے ماں کے پیچھے سے آکر چمٹے ہیں۔ وہ سب سے پہلے سجدہ میں گر پڑی خدا کا شکر ادا کیا جس نے اُس کو یہ خوشی کی گھڑی دکھائی۔ اس کے بعد دونوں بچّوں

کو ساتھ لے یتیم بچوں اور رانڈ عورتوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہوئی۔ یکایک اُس کی نگاہ ایک ایسے اپاہج بچہ پر پڑی جس کا صرف ایک ہاتھ تھا اور اس سے وہ اپنی آنکھیں ڈھانکے ہوئے تھا۔ بچہ نے کئی دفعہ قصد کیا کہ نوالہ توڑے مگر آنکھیں چونکہ دُکھ رہی تھیں روشنی کی جوت تیر کی طرح پڑتی تھی۔ لوگ کھا پی کر اُٹھ گئے اور جب کمرہ بالکل خالی ہو گیا تو یہ بچہ بھی خالی ہاتھ اُٹھا۔ اس بچہ کے ماں اور باپ دونوں پچھلے سال طاعون میں مر چکے تھے۔ سیدھے ہاتھ میں ایسا پھوڑا نکلا کہ ڈاکٹر نے ہاتھ کاٹ دیا۔ بدنصیب بچہ کی عمر سات یا آٹھ سال کی ہوگی۔ جب اس نے دیکھا کہ سب لوگ اُٹھ گئے تو ٹھنڈا سانس بھر کر بھوکا اُٹھا! یہ سانس بظاہر معمولی تھا مگر نسترن نے اُس کو پڑھا جس میں یہ جذبہ پوشیدہ تھا کہ دُنیا میں لاکھوں اور اس مجلس میں بیسیوں مائیں موجود ہیں۔ مگر کوئی ایسی ماں نہیں کہ مجھ بے ماں کے بچے کو اپنے ہاتھ سے کھانا کھلا دیتی۔ نسترن اس خیال سے لرز گئی اور اس کی معصوم خواہش میں جو موجودہ تہذیب و تمدن کے اعتبار سے قطعاً ناجائز اور مسلمانوں کے بچہ کی مامتا والوں سے یقیناً جائز تھی۔ اس درجہ مستغرق ہوئی کہ بچہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا مگر وہ بدستور محو رہی۔

وسیم دُلہن انگاروں پر ہر وقت لوٹ رہی تھی۔ اس وقت نہ معلوم کس دُھن میں باہر نکل کھڑی ہو گئی۔ بچہ چلنے لگا تو ہاتھ آنکھوں پر تھا۔ دیکھ نہ سکا کہ کوئی کھڑا ہے۔ پاؤں وسیم دُلہن کے پاؤں پر پڑا۔ کھرنسترے جوتیاں کیچڑ میں لتھڑی پتھڑی تکلیف کے علاوہ وسیم دُلہن کی جوتی بھی خراب ہوئی۔ اور پاؤں بھی مٹی میں بھرا۔ سخت غصہ آیا۔ بچہ کی بغل میں رات کے اوڑھنے کا ایک چیتھڑا کمبل تھا۔ اُس کے چہرہ پر ایک تھپڑ اس زور سے مارا کہ بلبلا گیا۔ کمبل کو دیکھ کر کہنے لگی "کمبخت چور پیٹ بھرا۔ چوری کی چوری کی پیٹ میں رکھا اور بغل میں بھی لے چلا۔" تھپڑ پڑ رہے

زور کا تھا۔ بچہ بلک گیا اور کہنے لگا "جی نہیں دیکھ لیجئے۔ یہ میرا کمبل ہے" اس کے رونے اور وسیم دلہن کے چلانے کی آواز سے نسترن چونکی۔ پہلی نگاہ سے بچہ کو ڈھونڈا اور نہ پایا۔ بہت پریشان ہوئی اور لپکی۔ دیکھا تو ادھر یہ معاملہ گذر رہا تھا۔ وسیم دلہن اُس کا ہاتھ پکڑے کھڑی تھی۔ اور چور بنا رہی تھی، بچہ ہر چند کہہ رہا تھا کہ "میرا کمبل دیکھ لیجئے" مگر اُسے یقین نہ آتا تھا۔ نسترن نے پہنچ کر کہا "کیا ہوا جناب"

وسیم دُلہن "ہوا کیا تو بلبلاتی کیوں دوڑی اور کفن پھاڑ کر آئی"

نسترن "میں دریافت کرتی ہوں کہ اس سے کیا خطا ہوئی"

وسیم دُلہن "یہ تیرا کون ہے۔ بھائی ہے۔ بھانجا ہے۔ بیٹا ہے جو پوچھتی ہے۔"

نسترن "یہ میرا سب کچھ ہے۔ مگر اس کی خطا تو معلوم ہو؟"

بچہ "بیگم صاحب میری آنکھیں دُکھ رہی ہیں۔ ان بیوی کے پاؤں پر میرا پاؤں پڑ گیا۔ اتنا کہہ کر لڑکے نے کمبل جھاڑا اور کہا "دیکھ لیجئے میں نے تو کچھ نہیں چُرایا"

نسترن نے آگے بڑھ کر بچہ کا ہاتھ چھٹایا اور کہا "لائیے میں آپ کی جوتی دھو دوں اور پاؤں صاف کر دوں۔ واقعی اس سے غلطی ہوئی۔ وسیم دُلہن نے اس کا جواب کچھ نہ دیا۔ مُنہ ہی مُنہ میں بڑبڑاتی چلی گئی۔ بچہ دروازہ میں پہنچ چکا تھا کہ پیچھے سے یہ آواز اس کے کان میں آئی "میاں تم نے کھانا کھا لیا۔؟"

اس کی آواز بھرائی تھی، اُس کی آنکھ سے آنسو نکل رہے تھے۔ چوری کے الزام نے اُس کے ہوش زائل کر دیئے تھے۔ وہ نسترن کا فقرہ اچھی طرح نہ سمجھ سکا۔ اور پھر کمبل جھاڑ کر کہنے لگا "دیکھ لیجئے میں نے روٹی نہیں چُرائی" نسترن نے اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور کہا "میں یہ نہیں کہتی۔ پوچھتی ہوں تم نے کھانا کھا لیا" کھانے کے سلسلہ میں آنے کی سزا بھگت چکا تھا۔ جھڑ اور چوری نے اُس کو سبق

دے دیا تھا اور اب اِس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ کسی طرح پیچھا چھڑا کر بھاگے۔ بچہ آخر بچہ تھا ننھے سے دل میں دہشت بیٹھ گئی تھی پھر یہی کہتا ہوا آگے بڑھا "جی ہاں کھا لیا۔"

نسترن نے چمکارا اور کہا "میاں میں دیکھ رہی تھی تم نے کھانا نہیں کھایا، آؤ چلو کھاؤ۔" چمکارنا اور سر پر ہاتھ پھیر کر تشفی اور دلاسا دینا قیامت تھی کہ دکھتی ہوئی آنکھیں دریا بہانے لگیں اور زخمی دل پھوٹ پڑا کہنے لگا "بیگم میرا ایک ہاتھ نہیں ہے آنکھیں دُکھ رہی ہیں روشنی میں نہیں کھا سکتا۔" نسترن "چلو میرے ساتھ چلو میں انتظام کر دوں گی۔"

"آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں مجھے جانے دیجیے اللہ مالک ہے پیٹ بھر دیگا۔"

نسترن "ہاں یہ درست ہے مگر جب کھانا موجود ہے تو کیوں نہ کھاؤ۔"

لڑکا اس وقت شدّت سے رویا اور کہا "بیگم میرا ہاتھ نہیں ہے۔"

نسترن "میں اپنے ہاتھ سے کھلاؤں گی۔"

لڑکا اس کا یقین نہ کر سکا اور کہنے لگا "نہیں آپ کیوں کھلانے لگیں مجھے جانے دیجیے۔ میرے پاس یہ تھوڑے سے چنے بندھے ہیں۔ کھا کر سو رہوں گا۔"

نسترن "تم ڈرو مت میں تمہاری ماں ہوں مجھے تم اپنی ماں سمجھو۔"

اب لڑکے نے ایک چیخ مار کر کہا "نہیں بیگم! میری ماں اللہ کے ہاں گئی اور میرے ابا کو بھی بُلا لیا۔"

نسترن لڑکے سے زیادہ روئی اور چمکارتی اور پیار کرتی اپنے خاص کمرہ میں لائی روشنی کی طرف اُس کی پشت کی اور اپنے ہاتھ سے نوالہ مُنہ میں دیا۔ عارف یہ تمام کارروائی اپنی آنکھ سے دیکھ رہا تھا اور خوب سمجھ رہا تھا کہ میں جس کے پلنگ پر کبھی اُجلی چادر بھی نصیب نہ ہوئی آج اِس عالی شان مکان کا مالک ہوں جس کی دہلیز

تک قالین کا فرش ہے۔ حق یہ ہے کہ نیک فرمانبردار اور پارسا بیوی اس طرح فقیر شوہر کو بادشاہ بنا دیتی ہے۔ نسترن بچہ کو سر پہ ہاتھ پھیر کر کھانا کھلا رہی تھی کہ دروازہ پہ غل غپاڑہ کی آواز سنائی دی۔ کوئی دو لمحے بعد ماما نے آکر کہا "سرکار تھانہ دار آئے ہیں۔ اسلام میاں کے ہاتھ میں ہتھکڑی پڑی ہوئی ہے" عارف گھبرا کر باہر گیا تھانہ دار نے کہا۔ "میں بے قصور ہوں۔ کپتان صاحب نے خود مقدمہ کی تحقیقات کی ہے۔ جمنا والے فقیر کے ہاں جو دو قتل ہوتے ہیں مریدوں کا بیان ہے کہ یہ اس میں شریک تھا۔ اور اس نے خود ڈپٹی صاحب کے سامنے اقرار کر لیا۔"

سوکن کی مصیبت نے حق یہ ہے کہ وسیم دلہن کی زندگی کو جلا جلا کر اور سلگا سلگا کر خاک کر دیا تھا۔ وہ بظاہر زندہ تھی۔ کھاتی بھی تھی۔ پیتی بھی۔ ہنستی بھی تھی۔ بولتی بھی۔ مگر دل کی کلی جو مرجھا چکی تھی اس کا کھلنا اب ناممکن تھا یہ صحیح کہ اپنی طرف سے نسترن عزت میں، توقیر میں، آداب میں، مراتب میں خاطر مدارات میں کبھی فرق نہ آنے دیتی اور نہ آنے دیا مگر اس کا یہ خلق اور انکسار بدبخت کے زخم پر کچوکے تھے۔ گھلتے گھلتے بدن سوکھ کر ڈھانچ اور طباق سا چہرہ سیپی رہ گیا۔ اکثر روتی، اپنی غلطیوں پر نادم، خود اپنے اوپر لعنت ملامت بھیجتی اب اس کو اچھی طرح یقین ہو گیا تھا کہ بیوی ماں باپ کے پیٹ سے بیگم نہیں پیدا ہوتی۔ لونڈی بن کر بیگم بنتی ہے گھر بھر پڑا سوتا اور وہ اپنے جھگڑوں میں لپٹتی الجھتی۔ اور اب تو نوبت یہاں تک پہنچ چکی کہ ہجوم افکار اور متواتر صدمات نے اس کو قبر کا مردہ بنا دیا تھا۔ وہ کہنے کو زندہ تھی مگر مردہ سے بدتر۔ کھڑی ہوتی چکر آتے بیٹھتی تو سر پھرتا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ چلتے چلتے گھمیری آئی اور وہیں بیٹھ گئی۔ اسلام کی خبر کان میں پہنچتے ہی ایک سنسنی آگئی۔ اٹھی دروازہ تک پہنچی جھانک کر دیکھا تو کلیجہ کا ٹکڑا سپاہیوں کے ہاتھ میں گرفتار کھڑا ہے ایک چیخ مار کر گری

اور بیہوش ہو گئی !

خُدا دشمن کو بھی یہ وقت نہ دکھائے۔ کس باپ کا بیٹا اور کس دادا دادی کا پوتا۔ قسیم وہ قسیم جس کے ادنیٰ اشارے پر ایک دو نہیں بیسیوں اور سینکڑوں آدمی جیل خانہ میں اندر سے باہر اور باہر سے اندر پہنچ گئے۔ نسیمہ وہ نسیمہ جس نے دو چار کی نہیں سینکڑوں کی مصیبتیں چٹکی بجانے میں حل کر دیں۔ آج قسیم اور نسیمہ کا حقیقی پوتا اسلام محض ماں کی بدولت گرفتار اور ذلیل و خوار تھا۔ نسترن سوکن کو بے ہوش دیکھ جلدی سے پانی لائی چھینٹے دیئے، عطر سُنگھایا۔ لخلخے رکھے۔ قسیم دُلہن کی آنکھ کھُلی تو عورت نہیں ایک پتھر تھا بے حس و حرکت پڑا تھا۔ مصیبتوں کی پوری پوٹ آنکھ کے سامنے تھی۔ اور بچہ کی قید اس کی بے بسی اور مجبوری کلیجہ پر برچھیاں چلا رہی تھی۔ دفعتاً کچھ خیال آیا اُٹھ کھڑی ہوئی۔ دروازہ میں پہنچی۔ جھانکا اور چلا کر کہا۔

"اے اسلام بدن پر بدھیاں کیسی ہیں ؟"

ماں کی آواز سنتے ہی اسلام کی ہچکی بندھ گئی۔ اور کہا۔

"سپاہیوں نے مارا ہے"۔

عارف کو مجرم سے کیا اس کی ماں سے بھی کوئی ہمدردی نہ تھی اور سچ یہ ہے کہ دونوں اس کے مستحق بھی نہ تھے۔ مگر نسترن کے اصرار اور عارف کی خواہش پر چونکہ تحصیلدار تھا، تھانہ دار نے اسلام کو اندر جانے کی اجازت دے دی۔ لاکھ صحبت خراب اور بے وقوف ماں کا بچہ تھا مگر اب سر پر آ کر پڑی تو چھکے چھوٹ چکے تھے۔ ایک ایک کا مُنہ حیرت سے تکتا تھا اور بلبلا بلبلا کر اس درد سے اپنی بے گناہی کا اظہار۔ اور سپاہیوں کی زیادتی کی داستان سُناتا تھا کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہونے تھے۔

یہ سب کچھ تھا مگر رہائی باپ کے بس کی تھی نہ ماں کے اور بہن کے اختیار کی تھی نہ بھائی کے۔ دس پندرہ منٹ اسلام اندر ٹھیرا۔ اس کے بعد تھانہ دار نے تقاضا کیا اور عارف نے کر چلا تو بدنصیب مجرم کے گلے میں صرف اکہری اچکن تھی۔ رات سر پر تھی موسم سرد۔ نسترن نے جلدی سے اپنا چادرہ اُتار کر اُس کو اُڑھا دیا وسیم دُلہن اُس سے بات کرنے کے قابل نہ تھی۔ اُس کی آواز مدہم ہو چکی تھی۔ بچہ اُس کی صورت دیکھتا رُخصت ہوا۔ اور وہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

گیارہ روز اور بارہ راتیں بدنصیب ماں پر جب تک مقدمہ طے ہوا۔ کس طرح کٹیں بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اب وہ سوکن اور نسترن سب کو بھول گئی تھی۔ بچہ کی تصویر ہر وقت آنکھ کے سامنے تھی۔ جوشِ دیوانگی میں یہاں تک ہوا ہے کہ راتوں کو زینہ کھول کر کوٹھے چڑھ گئی۔ اور گلی میں دیکھا کہ شاید آ رہا ہو۔

آخر وہ رات سر پر آگئی جس کی صبح ماں اور بیٹے کی تقدیر کا فیصلہ کرنیوالی تھی۔ غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی وہ ماں جس نے نو مہینے پیٹ میں رکھا دو سال کے قریب خونِ جگر پلایا۔ اس خیال سے کہ بے گناہ بچہ کی اذیت کا سبب میں ہوں بیری کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔ اس مصیبت اور تکلیف پر اس یقین نے کچھ ایسی نمک مرچیں چھڑکیں کہ مچھلی کی طرح چاروں طرف تڑپنے لگی۔ وہی وسیم دلہن جس کو بیگم بیگم کہتے عارف کا مُنہ خشک ہوتا تھا اور آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتی تھی۔ اس وقت اُس کے قدموں میں جا گری۔ اُسی نسترن کے آگے جس کے بچہ کو ایک معمولی گیند کے واسطے تین گھنٹہ دروازہ پر کھڑا رکھا اور کُنڈی نہ کھولی ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہوئی۔ کل جس بن ماں کے بچہ فاروق کی معصوم اُنگلیاں قصائی کی چھُری سے ذبح کیں اور دَھل دَھل خون بہا کر بھی تیوری پر بل نہ آیا۔ آج اُس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ مگر اب اِن باتوں میں کیا رکھا تھا۔ خدا کی لاٹھی بے آواز تھی۔ دیر تھی۔

اندھیر نہ تھا پاپ کی ناؤ بھر کر ڈوبنی تھی۔ عارف اور نسترن تو اُسے سمجھا رہے تھے مگر جس بے گناہ فاروق کے یہ الفاظ اب تک کانوں میں امانت تھے" اچھی اب نہیں:" وہ کبھی تتلاتی ہوئی زبان میں کہہ رہا تھا۔"

"روؤ نہیں"

رات کی ہر گھڑی سال سے زیادہ تھی کلیجہ پر گھونسے مارتی، بلبلاتی اور دعائیں مانگتی کہ کل اسلام کو گلے سے لگا کر کلیجہ ٹھنڈا کروں۔"

دن کے دو بجے ہوں گے جب ماں کے کانوں میں یہ آواز پہنچی کہ پندرہ سولہ برس کی کمائی لُٹ گئی اور اسلام اُس کی آنکھوں سے ہمیشہ کو اُس کے سینہ سے سدا کو اوجھل ہوا اور چھُپ گیا۔ عبور دریائے شور کی سزا ہو گئی۔ اور جمعرات کو روانگی ہے۔ پچھاڑیں کھاتی تھی، ٹکریں مارتی تھی، سر پھوڑتی تھی، مگر نتیجہ کچھ نہ نکلتا تھا۔ اُسی ماں کے دل سے پوچھنا چاہیئے۔ جس کے گھر سے جوان شیر کا زندہ جنازہ نکل رہا تھا کہ کیا گذر رہی ہے۔

دن ہوا کی طرح گذر ے اور وہ رات بھی آ پہنچی جس نے نسترن کی غیر معمولی ضد اور عارف کی مجبورانہ کوشش سے ماں کو بچہ کی آخری صورت دکھا دی۔ یہ قیامت خیز منظر رات کے دو بجے واقع ہوا۔ وسیم دلہن ہتھکڑی اور بیڑی والے اسلام کو کلیجہ سے لگائے کہرام مچا رہی تھی۔ بالآخر ماں کی نگاہِ آخر بچہ کے چہرہ پر پڑی اور وسیم دُلہن کا لال ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔

عارف اور نسترن دونوں وسیم دلہن کو تسکین دے رہے تھے مگر یہ مُصیبت وہ مُصیبت تھی جس میں راحت کی اُمید نظر نہ آتی تھی۔ گھبرا کر باہر نکلی تھی انگنائی میں ٹہل کر پھر اندر آ جاتی تھی۔ یہی کرتی پھر رہی تھی چار بجے کا وقت ہو گا۔ بزمِ فلک چاند اور تاروں سے کھچا کھچ بھری تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے زور شور سے

چل رہے تھے. حالت اضطراب میں وسیم دلہن نے اوپر نگاہ اُٹھائی ٹکٹکی باندھے
اپنی مصیبت میں مستغرق تھی کہ چاند کے پاس ایک ابر کا ہلکا سا ٹکڑا نمودار ہوا
اُس طرف متوجہ تھی اور دل میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ سچ ہے کہ اسلام کو پال
پوس کر چھاتی پر لٹا کر کلیجہ پر سُلا کر اِسی لیے جوان کیا تھا کہ آج رات کو وہ ہمیشہ
کو مجھ سے چھوٹ جائے! ہائے مجھ سے زیادہ بدنصیب دُنیا میں کون ہوگا. پٹتی پر
پڑی اور ایسی پڑی کہ سر اُبھارنے کی فرصت نہ ملی! سنتی ہوں کہ اس ہاتھ دے
اِس ہاتھ لے. میں نے آج تک کسی کا کیا بگاڑا مگر ایک دن بھی تو چین کا دُنیا میں نہ
گذرا شادی ہوئی تو میاں کالے کوسوں پردیس سدھارے. خدا خدا کر کے لوٹے
تو دو روز بعد ہی قبر میں جا سوئے دوسرا گھر بسایا تو اس میں یہ پتھر پڑے. اب اِس
صدمہ نے تو جان ہی پر بنا دی. تارے اور چاند سب چمک اور دمک رہے ہیں
بادل پھٹ پھٹ کر چاند نکل رہا ہے. اب کے تو اسلام کی صورت نظر آجائے.

(۶)

قصرِ نسیمہ میں داخل ہوتے ہی پاک روح نے اُن لاتعداد روحوں کا مطالعہ
جو اپنے اعمال کی سزا بھگت اور افعال کا انعام پا رہی تھیں. وہ ایک روز عورتوں
کے طبقہ میں اِدھر اُدھر پھر رہی تھی، کامیاب روحوں کو دیکھ دیکھ کر اُس کا دِل باغ
باغ ہو رہا تھا کہ ایک کونے سے رونے کی آواز اُس کے کان میں آئی. تعجب یہ
تھا کہ یہ قطعۂ چمن بھی جنت الفردوس میں داخل تھا. جہاں ہر روح اطمینان کے ساتھ
راحتِ ابدی کے لُطف اُٹھا رہی تھی. نسیمہ حیران ہو کر اِدھر پہنچی تو کیا دیکھتی ہے
کہ لعل و یاقوت کے بیش بہا زیوروں کے ساتھ ایک طلائی زنجیر بھی اُس عورت کے
پاؤں میں پڑی ہوئی ہے. جنت کی تمام نعمتیں اُس کے واسطے موجود ہیں. مگر

یہ اجازت نہیں کہ وہ اس قلعہ سے نکل کر دوسری جگہ جا سکے۔ اُس کی آزادی مشروط اور اُس کی جنت محدود ہے۔ نسیمہ جتنی قریب پہنچتی تھی اتنی ہی اُس کی حیرانی بڑھتی جاتی تھی۔ کامیابی کا ہر نشان اس کے پاس موجود تھا۔ فرائض کی غفلت کا تِل برابر دھبّہ اس کے اعمال میں نہ تھا۔ رضامندیٔ شوہر کا گرانقدر جھومر اس کے ماتھے پر تھا۔ ساس سُسر کی عظمت ماں باپ کی خدمت کے درخشندہ آویزے اُس کے کانوں میں تھے۔ نمازیں اُس کی پُوری تھیں۔ روزے اُس کے مکمل تھے۔ نسیمہ نے ہرچند غور کیا مگر راز سمجھ میں نہ آیا۔ اشتیاق زیادہ ہوا تو خود اُسی سے دریافت کیا کہ ماجرا کیا ہے۔

عورت کی رُوح مسکرائی اور کہا۔

"کیا بتاؤں اور کیوں کر کہوں کہ کس غلطی میں گرفتار ہوں۔ میں نے جس کو تِل سمجھا وہ مَن اور رائی جانا وہ پہاڑ نکلا۔ ایک ذرہ بھر غفلت نے جنت کو دوزخ بنا دیا۔ سب کچھ ہے مگر اس جگہ سے قدم نہیں سرکا سکتی۔

معاملہ یہ ہے کہ میں نے کنوار پنے میں میکہ کو سراہا اور والدین کو نعمت غیر مترقبہ کہنے والے تو زبان سے کہتے ہیں مگر میں دل سے سمجھتی تھی کہ ماں کی دہلیز اور باپ کا گھر ایک روز چھوٹنے والا ہے۔ میں یہاں سدا ٹکنے اور ہمیشہ رہنے والی نہیں۔ یہاں سے روانہ ہونے کے بعد آنکھیں اِن دونوں پیاروں کی صورتوں کو ترسیں گی اور یہ نظر نہ آئیں گے۔ یہ میری صورت کے عاشق اور نام کے دیوانے ہیں۔ اِن کا غصہ محبت ہے۔ اِن کی خفگی عنایت ہے۔ اِن کا طیش شفقت اور ان کی نفرت صداقت۔ اِن کی آہ لگنے والی۔ اِن کی دُعا قبول ہونے والی اور درِ اجابت تک پہنچنے والی۔ اور ان کی فریاد عرش کا کنگورہ ہلانے والی ہے۔ یہ میری کمائی کا وقت ہے۔ بچپن نہیں، اور دُور اندیشی کے دِن ہیں کوارپنے

نہیں۔ میں اپنے یقین پر کاربند رہی اور اسی یقین کے موافق وہ وقت آیا کہ میں اُن کی چوکھٹ سے وداع ہوکر پالکی میں سوار ہوئی۔ لڑکیاں عام طور پر اُس وقت روتی ہیں۔ میں بھی روئی۔ مگر میرے رونے میں ہنسنا، میری جُدائی میں اطمینان اور میرے رنج میں خوشی شامل تھی۔ جن کے فراق کا رنج ہوتا ہے۔ جن کی جدائی تکلیف دیتی ہے جُدا ہونے والی سے کوئی پوچھے کہ دلہن تیرا رونا سچا اور غم درست مگر یہ تو بتا کہ اِن ماں باپ کو خوش رکھ کر چلی یا جلا ستا کر۔

خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے میں اس کسوٹی پر کندن کی طرح چمک رہی تھی۔ کوارپنے کا ایک لمحہ بھی۔۔۔۔۔ ایسا نہ گزرا تھا کہ ماں باپ بہن بھائی نوکر چاکر پڑوس ہمسایہ کسی کو بھی کبھی تکلیف دی ہو، رنج ضرور تھا مگر رنج سے زیادہ خوشی صدمہ یقیناً تھا۔ مگر اطمینان بھی صدمہ سے کم نہ تھا۔ سُسرال پہنچی تو میاں کو میاں بنانے میں کچھ دقت نہ اُٹھانی پڑی۔ ساس کو کبھی ایسا موقع ہی نہ دیا۔ کہ وہ آڑی ٹیڑھی باتیں کرے۔ بہو بن کر گئی اور بیٹی بن کر رہی۔ میں بیٹی بڑے باپ کی ضرور تھی مگر بیوی بھی کسی غریب فقیر کی نہ لکھ پتی مالدار کی۔ میرا شوہر متوسط حیثیت کا آدمی تھا جو شروع ہی سے قدردان معقول انسان نکلا۔ اتنی بات ضرور تھی کہ ہم دونوں کی محبت کو جو روز بروز ترقی و استحکام ہوا، اُس کی کوشش سے میں کبھی غافل نہ رہی۔ مجھ کو بڑی بوڑھیوں نے بتا دیا عقلمندوں نے پڑھا دیا اور دُنیا کے تجربہ نے سکھا دیا تھا کہ مرد کی محبت قابلِ اعتبار نہیں۔ یہ طوطے کی طرح دیدے بدلنے والی ذات ہے۔ بیوی تو کیا یہ بے وفا اُسی کے نہیں جو کلیجہ کا ٹکڑا اور آنکھوں کی ٹھنڈک کہلائے۔ آج بیوی پر فریفتہ اور بچوں کے عاشق زار ہیں، کل دوسروں کی محبت میں گرفتار ہو کر معصوموں کی بہ مٹی خوار ہو رہی ہے کہ الٰہی توبہ! یہی وجہ تھی کہ میں نے ان کی عنایتیں

دودھ کا اُبال سمجھیں اور جب تک وہ کئی بچوں کے باپ نہ ہو گئے۔ میں نے ترقی محبت کی کوشش میں کمی نہ کی۔ جس قدر اُن کی محبت بڑھتی تھی اُسی قدر میری خدمت میرے خسر بیٹے کے محتاج نہ تھے۔ وہ خود پچاس روپیہ کے وظیفہ خوار تھے۔ یہ اُن کی مصلحت تھی اور نہایت دُور اندیشی کہ میرے شوہر کے ملازم ہوتے ہی اُنھوں نے ہم دونوں میاں بیوی کو ایک چھوٹا سا مکان دیوار بیچ لے الگ کر دیا۔ بہوئیں اِس علیحدگی کی منتظر رہتی اور خدا سے چاہتی ہیں کہ علیحدہ ہو کر خود مختار ہوں مگر میں اِس عالم ارواح میں مالک زمین و آسمان کو شاہد کر کے کہتی ہوں کہ مجھ کو مطلق خوشی نہ ہوئی۔ میری ساس وہ ساس تھیں کہ مائیں اُن پر سے قربان مگر چونکہ حکم تھا اِس لئے طوعاً کرہاً تعمیل کرنی پڑی اور میں بیوی سے گھر والی ہو گئی۔

میرے شوہر ابتدا میں بیس روپیہ کے نوکر تھے سال بھر بعد پچیس اور پھر تیس اور آخر کار تیس چالیس پانے لگے۔ اُس وقت ہمارے ابا جان نے دنیا کو چھوڑ کر یہ جگہ آباد کی۔ اماں جان بیوہ ہوئیں تو اُن کے ساتھ ایک کواری لڑکی محمودہ گیارہ برس کی تھی۔ ہم دونوں میاں بیوی کا یقین تھا کہ اگلے زمانہ کے آدمی ٹکے گز کی چال کچھ نہ کچھ کھُرچن ضرور ہوگی۔ مگر یہ بھرم ہی بھرم تھا۔ اُن کے پاس سوا خولی کڑوں کے جن کو ہم ٹھوس سمجھتے تھے اور کچھ نہ تھا۔ اور چار روپیہ مہینہ جو ہم اُن کو دیتے تھے، اُسی میں دونوں ماں بیٹیاں گزر کرتی تھیں۔ کپڑا لتا کھانا پینا سب اُسی میں تھا۔ چار روپیہ ہستی ہی کیا رکھتے ہیں۔ ڈھائی تین مہینے بعد ہی اماجان نے بیٹے کو دو کڑے بیچنے کو دیئے۔ ہم جس کو تین چار سو کا مال سمجھتے تھے وہ چالیس کا نکلا۔ یہ معمولی رقم کب تک ساتھ دیتی۔ چھ سات مہینے میں ختم ہوئی اور اب ان دونوں ماں بیٹیوں کا سہارا صرف ہمارے چار روپیہ تھے گو آج مجھے دُنیا سے کوئی تعلق نہیں۔ مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ زمانہ جو لڑکیاں

بڑھیاں بنا کر خاک میں ملا چکا وہ طبقہ نسواں کے واسطے قابلِ فخر تھیں۔ اور
وقت جن کو جوان کرتا ہوا ترقی کے میدان میں پہنچا رہا ہے یہ کچھ عورتوں ہی کے
واسطے نہیں عورتوں اور مردوں دونوں بلکہ مذہب تک کے واسطے لائقِ افسوس
ہیں۔ ماں جس نے گوشت کے لوتھڑے کو خونِ جگر پلا کر ہٹا کٹا موٹا تازہ اور اس
لائق کیا کہ چالیس روپیہ ماہوار کمانے لگے۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ جس قدر حق
جتانے کم تھا دنیا جس وقت میٹھی نیند کے مزے لیتی لیتی تھی، خلقت جس وقت
نرم اور گرم بچھونوں میں پڑی سوتی تھی، باپ جس وقت بے خبر پڑا خرانٹے
لیتا تھا۔ اُس وقت ماں اپنی نیند اڑا کر سکھ گنوا کر اٹھ بیٹھتی تھی اور اس خیال
سے بہا لچہ بدل دیتی تھی کہ گیلا تکلیف نہ پہنچائے۔ جب وقت نے اس کا پاسہ
پلٹ اور سہاگ کا زریں لباس اتار کر بیوگی کا برقعہ اڑھایا، تو یہ وقت تھا کہ جو
ہاتھ گھڑیوں تھپکنے سے نہ تھکتے تھے اُن میں رعشہ پڑا۔ جو پاؤں گھنٹوں ٹہلتے ٹہلتے لوری دیتے
تھے اُن میں سکت باقی نہ رہا۔ اور جو آنکھیں چاندنی رات میں بیٹھ کر کلیجے کے ٹکڑے
کے واسطے کرتہ تیار کرتی تھیں۔ اُن میں پانی اتر آیا۔ ضرورت تھی کہ وہ ننھے ننھے
ہاتھ جوان ہاتھوں کو تھکا کر طاقتور ہوئے وہ ننھا منا سر جو اس سر کو جھکا کر
صحیح الدماغ بنا اپنے کندھے عاجزی سے جھکا دیتا۔ مگر ہمارے کانوں میں تیل تھا۔
ہماری آنکھوں پر پردے تھے۔ ہم سے زیادہ محسن کش، ہم سے زیادہ اندھا، ہم
سے زیادہ بہرا کون ہوگا کہ ہم نے اُن کے حقوق نہ پہچانے اور اندھی آنکھیں جب
دوسری آنکھوں کو اندھا کر کے روشن ہوئیں تو اُن پر محبت کی نظروں کے بجائے
نفرت کی نگاہیں پڑنے لگیں۔ میں نے جو نسوانی ہستیوں کو قابلِ ناز کہا اُن میں میری
اماں جان بھی تھیں۔ ہم نے اُن کے چار سے پانچ نہ کئے مگر انہوں نے التجا کا ہاتھ
ہمارے آگے نہ پھیلایا۔ مجھے یہاں آ کر معلوم ہوا کہ انہوں نے اس کنواری بچی کے نئے

ساری ساری رات فاقہ سے گذاری مگر کسی دوسرے پر اپنی تکلیف کا اظہار نہ کیا۔ یہ صحیح کہ اِس کی ذمہ دار ہوں میں بھی مگر بڑا بار اُن کے صاحبزادے کی گردن پہ ہے۔ ماں باپ کا اثر اولاد پر کس طرح پڑتا ہے۔ اِس کا ثبوت محمودہ کی زندگی تھی میں نے بارہا اس سے کہا کہ میرے ساتھ کھانا کھالے مگر اُس نے ایک دفعہ بھی منظور نہ کیا۔ اور ہمیشہ یہی جواب دیا کہ "پیٹ بھرا ہوا ہے"

رمضان المبارک کے مہینے میں میں نے تجویز کی کہ سب لڑکیاں اپنی اپنی افطاریں لاکر ایک جگہ یعنی میرے ہاں روزہ کھولا کریں۔ محمودہ بھی اس میں شریک تھی۔ گرمی چونکہ قیامت کی تھی اس لئے ہم سب انگنائی میں روزہ کھولتے تھے۔ محمودہ اپنا شربت کا گلاس برف فالودہ پڑا ہوا طشتری سے ڈھانک کر لاتی اور سب کے ساتھ روزہ کھولتی ہاں اتنی بات ضرور ہے کہ اس نے کبھی طشتری میں ہاتھ نہ ڈالا اور نہ اپنا گلاس کسی کو دیا۔ وہ بظاہر ہمارے مذاق اور ہنسی ٹھٹول میں شریک ہوئی مگر اِس کا دِل چونکہ مُردہ سا تھا اس لئے میں اُس کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتی۔ وہ دِن گذر گئے اور میں وہ باتیں بھُول بِسر گئی جب میں یہاں پہنچی ہوں تو معلوم ہوا کہ جس کے بھائی کی کمائی میں میں دودھ شربت کیوڑہ اور فالودہ سے روزہ کھولتی تھی۔ اُس بدنصیب کے گلاس میں محض سادہ پانی ہوتا! اِس کو بھر رمضان سحری نصیب ہوئی نہ افطاری نماز مغرب کے بعد چٹنی سے دو روٹیاں کھاکر روزہ کی نیّت کر لیتی اور سو جاتی تھی۔

مجھے اب تک یاد ہے کہ چار چار اور پانچ پانچ سیر برف روزانہ آتی پھک پھک کر گئی اور گھُل گھُل کر گئی مگر اُس کو دینا نصیب نہ ہوا۔ اس لاپرواہی کے جرم میں اُس خود غرضی کی سزا میں آج یہ عذاب بھُگت رہی ہوں۔ مگر مجھے اقرار ہے کہ میرا قصور سچا اور غلطی درست اُس بچی کی طبیعت سراسر آفریں اور مرحبا کی

مستحق ہے جس نے اپنی بیوہ ماں کا بھرم نہ کھلنے دیا۔ اور میری مغرور طبیعت لاکھ لعنت و ملامت کی مستوجب کہ بھول کر بھی اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔

"یہ سزا ایک ہزار سال کے واسطے تجویز ہوئی ہے مگر مجھے ہر لمحہ ہزار سال ہے"۔

نسیمہ یہ داستان سن کر لوٹنا چاہتی تھی کہ دوزخ کے طبقہ نسواں سے ایک عورت کے ہنسنے کی آواز آئی! داخلۂ فردوس کے بعد یہ پہلا اتفاق تھا کہ ادھر سے نسیمہ نے آواز سنی۔ دوزخ کا طبقہ طرح طرح کے عذاب قسم قسم کی تکلیفیں! سوچنے لگی کہ یہ ایسی کون سی بے غیرت روح ہے جو اس عذاب میں بھی ہنس رہی ہے۔ آگے بڑھی اور دوزخ کے قریب پہنچی۔ بے شمار روحیں عذاب میں گرفتار اور اعمال پر شرمسار تھیں اور ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ صرف ایک دفعہ محض آزمائش کے طور پر ہم پھر دنیا میں بھیج دیئے جائیں۔ تو ایسی نیک زندگی بسر کریں کہ فرشتے ہمارے دامن پر نماز پڑھیں۔ ان کی گریہ و زاری بے سود اور بیکار تھی۔ عذاب کے فرشتے طرح طرح کی اذیتیں پہنچا رہے تھے۔ نسیم دوزخیوں کی کیفیت دیکھ کر تھر تھر کانپنے لگی۔ اور ادھر چلی جہاں سے ہنسنے کی آواز آ رہی تھی۔ سلام کیا اور پوچھا۔

"بی بی اس تکلیف میں ہنسنے کا کیا موقع ہے۔"

اب اس روح نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا۔

"ہنسنا ہی نہیں میں خود دنیائے ناپائیدار کی ایک تعجب انگیز ہستی ہوں۔ میں ایک ایسی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئی جو قدامت میں جکڑی ہوئی تھی۔ برخلاف اس کے میرا باپ جدت کا دلدادہ اور قوت کا ساتھی تھا مگر چونکہ دونوں کو اختلاف مزاج میں ایک عرصہ گذر چکا تھا اور عمریں ختم کے قریب پہنچ چکی تھیں اس لئے کوئی خاص لڑائی جھگڑا نہ ہوتا تھا۔ مگر وہ محبت جو میاں بیوی میں ہوتی

چاہیئے دونوں اُس سے محروم تھے۔ زندگی نام ہے وقت کو لُطف اور اطمینان سے بسر کر دینے کا شوہر بیوی کی آسائش کا متمنی اور بیوی خاوند کی راحت و آرام کی کوشاں یہ دونوں ہمارے گھر میں نہ تھیں۔ مجھے اپنے بچپن کے زمانہ کا ہوش نہیں۔ نہ اُس وقت کا حال معلوم ہے۔ جب میرا وجود ہی نہ تھا کہ میاں بیوی کے اختلاف مزاج نے کیا کیا گُل کھلائے۔ مگر میں نے جو دیکھا اور جو سمجھ سکی وہ یہ تھا کہ ابا جان دِن تو دِن رات کا بھی بڑا حصہ مردانہ میں اخبار بینی یا ورق گردانی میں گذار دیتے۔ اور اماں جان رات کیا دِن کو بھی اوراد و وظائف ہی میں مصروف رہتیں۔ مجھ پہ اُس وقت تو اماں جان ہنستی تھیں مگر یہاں آکر اُن کو بھی معلوم ہو گیا کہ عورت جب تک دنیاوی فرائض نہ ادا کرے محض دینی خدمات اُس کے واسطے مُفید نہیں۔ یہ صحیح ہے کہ اِن دونوں میاں بیوی کی تکالیف و ناموافقت کا تمام بار اُن کے والدین پر ہے کہ قبل از نکاح فریقین کے مذاق پر نظر نہ ڈالی۔ مگر ابا جان بھی اِس الزام سے بری نہیں ہیں کہ انہوں نے بعد از نکاح رفع اختلاف کی کوشش نہ کی۔ یہ دُرست کہ تغیّر فطرت آسان نہیں۔ مگر مسلمانوں کے موجودہ تمدّن کو ملحوظ رکھ کر یہ لازمی اور ضروری ہے کہ لڑکی کو اچھّی طرح سمجھا اور پوری طرح بتا دینا چاہیئے کہ اُس کی خواہش اُس کا اطمینان صرف ماں کی دہلیز تک ہے۔ وداع ہوتے ہی اُس کی ہر قوت دُنیا نے سلب کر لی اور وہ پیدا ہی اِس لیئے کی گئی ہے کہ جو شخص شوہر کی حیثیت میں اُس کے سامنے آتا ہے اُس کا دِل مسخّر کرے۔ میں نے شاید یہ تو ابھی کہا ہے کہ فطرت کا تبدیل کرنا بہت مشکل ہے لیکن تم نے اور میں نے دونوں نے دُنیا میں دیکھ لیا ہے کہ بُلبُل ہزار داستان جو شاخ گُل پر بیٹھ کر ایک عالم کو تڑپا دیتی ہے پنجرے میں قید ہو کر بھی اپنی خوش الحانی کا فرض ادا کر سکتی ہے۔ اس سلسلہ میں فطرت اور فرائض دونوں کو لازم و ملزوم کیوں نہ سمجھو۔ مَرد

نوکری کرتا ہے آقا کے حکم کی تعمیل اُس کا فرض ہے۔ لیکن اگر وہ فطرتاً رات کے بارہ بجے ایک قتل کی تحقیقات کو جانا ظلم سمجھتا ہے تو اُس سے کس کم بخت نے کہا تھا کہ تو تھانہ داری کی کوشش کر۔ یہ اختلاف مزاج اور ناموافقت کے جھگڑے صرف جھوٹی تمدنی کے نتائج ہیں۔ یہ ہی میاں تھے اور یہ ہی بیویاں تھیں اطمینان اور مزے سے رہتے تھے۔ ہئے ہے نہ کھے کھے۔ اب مسلمانوں نے دوسروں کی دیکھا دیکھی حقوقِ نسواں کے نعرے بلند کرنے شروع کئے۔ مگر عقلمندوں کو پہلے یہ سوچ لینا چاہئے کہ اسلام نے جو اُن کو حقوق عطا کئے ہیں اُن کا عشرِ عشیر بھی دوسری جگہ موجود نہیں۔ اس وقت ایک عورت شوہر کے بازو پر سہارا تھرکتی پھڑکتی چہکتی مٹکتی جاتی ہوئی بہت اچھی معلوم ہوتی ہے وہ شوہر بھی ہے یا نہیں یہ تو خدا جانے۔ مگر پردہ میں بیٹھنے والیوں کو اُس کی آزادانہ اور پُر لطف زندگی پر ضرور رشک آئے گا۔ مگر عقلمند یہ بھی سوچ لیں کہ اُن پٹاپٹی کے پردوں، رنگ آمیز چلمنوں اور گنگا جمنی کواڑوں کے بعد اندر کا فرش مخمل نہیں دلدل ہے! پہلی سزا تو آزادی نے اس کو یہ دی کہ دُنیا میں کوئی چیز اُس کی ملک ہی نہیں۔ جو ہے۔ وہ شوہر کی دوسرا سلوک یہ ہے کہ شوہر کے ہاتھوں کیسی ہی مصیبت کتنی ہی اذیت کیوں نہ پہنچ جائے دوسرے کی مجال نہیں کہ دخل دے، ماں بھی موجود ہے باپ بھی، بہن بھی اور بھائی بھی مگر انتخاب نکاح میں کسی کا مشورہ تھا نہ صلاح جو کیا وہ بھگتو جو پڑے وہ اُٹھاؤ۔ خیر میں اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں سمجھتی۔ آمدم برسرِ مطلب۔

دن ہمارے سامنے راتوں سے راتیں دنوں سے بدلتی تھیں۔ مگر مجھے یاد نہیں کہ میں نے کبھی بھی دونوں میاں بیوی کو خلوص و محبت سے باتیں کرتے دیکھا ہو۔ شکایت جو سبب ہے، محبت کا کبھی کسی زبان پر آئی ہی نہیں۔ جس طرح جیل خانے کے قیدی اپنا وقت پورا اور دن ختم کرتے ہیں۔ اسی طرح معلوم ہوتا تھا کہ یہ دونوں

بہ جبر واکراہ زندگی کی شکرم میں جُتے ہوئے قدم اُٹھا رہے ہیں۔ میرا کوار پنہ مزور تھا مگر بچہ نہ تھی۔ سمجھتی تھی جو ہوتا تھا اور جانتی تھی جو دیکھتی تھی۔ متعجب تھی اور متحیر کہ آخر ان دونوں جسموں میں دل ہیں یا پتھر کہ کبھی کوئی خواہش یا اُمنگ پیدا ہی نہیں ہوئی۔ ابا جان ہیں وہ دن بھر باہر رہے۔ رات کو مسافر کی طرح سرائے سمجھ کر گھر میں آئے اور پڑ رہے۔ اماں جان ہیں وہ دن بھر گھر کے کام دھندے میں لپٹی رہیں رات کو جانماز پر بیٹھیں تو دو بجا دیئے۔ میں نے اماں جان کو کبھی خندہ پیشانی ابا جان سے مجھے یاد نہیں کہ بات کرتے دیکھا ہو۔ کچھ ایسی خاموش اور گم سُم طبیعت لے کر آئی تھیں کہ کسی فرحت یا دلچسپی سے واسطہ ہی نہ تھا۔ گانے میں وہ شریک نہ ہوتیں۔ ہوا خوری کو وہ نہ نکلتیں۔ سیر کو اُن کا جی نہ چاہتا، جلسہ کی اُنھیں خواہش نہ ہوتی۔ ہاں مجبوری سے یا ضرورت سے جب میں جوان ہو چکی ہوں اُس وقت البتہ کوئی دن یا کوئی رات ایسی نہ گذری کہ اُنھوں نے میری شادی کی فکر میں اُنھیں شریک نہ کیا ہو۔ یہاں تک ہوا ہے کہ ابا جان نے ایک موقع پر بگڑ کر کہہ بھی دیا کہ۔

"کیا تم کو میرا یہاں آ کر پڑ رہنا بھی زہر لگتا ہے کہ روز جھگڑا چھیڑ دیتی ہو۔"

مگر اُن کے کان پر جوں نہ چلی، خرابی آ کر یہ پڑ گئی تھی کہ دونوں کے خیالات مختلف، طبیعتیں مختلف، تجویزیں مختلف، رائیں مختلف، جس لڑکے کو ابا جان اچھا سمجھیں وہ اماں جان کی رائے میں کافر اور جس کو اماں جان پسند کریں، وہ ابا جان کے خیال میں اُلو۔ باتیں کئی موجود تھیں اور نئے پیغام بھی آتے رہتے تھے مگر اماں جان کا کام صرف اتنا تھا کہ حرف بحرف ابا جان کے سامنے پیش کر دیتی تھیں اور وہ بھی کچھ اس قدر نخوت اور تمکنت سے کہ ابا جان تو ابا جان مجھ تک کو سخت ناگوار ہوتا تھا۔ ایسا تکڑا توڑ جواب دیتیں کہ بیچارے مُنہ تکتے رہ جاتے۔

ایک بات کہہ دی اور چپ ہو گئیں۔ اب سوال کرتے کرتے مر جائیں مگر اُن کو جواب دینا قسم۔ اماّ جان کی یہ بدمزاجی کنبہ بھر میں مشہور ہو چکی تھی۔ اور مرد عورت ہر شخص نام رکھتا تھا۔ مگر اُنہوں نے پرواہ نہ کی۔ ہم خوش نصیب تھے کہ سر پر دادا جان کا سایہ موجود تھا۔ مگر بہو کی بدمزاجی سے اُن کا بھی ناک میں دم تھا۔ اور وہ کھُلم کھُلا کہتے تھے کہ۔ "دوزخ کا پہلا طبقہ اُن سنگ دل والدین سے لبریز ہوگا جو اولاد کے نکاح میں عادات و اطوار کا لحاظ نہیں کرتے اور یہ انتخاب مخالفتِ مزاج کی وجہ سے زندگی عذاب کر دیتا ہے۔" میں جب تو نہ کہتی تھی مگر اب کہتی ہوں کہ جن لڑکیوں کی تربیت دامنِ قدامت میں ہوئی وہ پھر بسا غنیمت ہیں۔ میں اُس وقت تو جہالت کہتی تھی اور آج اُس کو نعمت سمجھتی ہوں۔ دادا جان اپنی لڑکی کے ہاں چلے گئے تھے اور گو ہماری پھوپی اماّں اپنی ذات سے بہت ہی معقول انسان تھیں۔ مگر تقدیر سے اُن کو ایسے طرار شوہر ملے تھے کہ سارا شہر اُن کے نام سے کانپتا تھا۔ فرضی دستاویزیں، جھوٹے مقدمے اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ دادا جان کا انتقال ہوتے ہی اُنھوں نے تمام جائداد پر قبضہ کر لیا اور کہہ دیا کہ مرحوم اپنی زندگی ہی میں بیٹی کو دے گئے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پھوپی جان بھی اُن کی عیاری میں برابر کی شریک تھیں۔ اُنہوں نے اپنی طرف سے غصب کی کوشش نہ کی ہو مگر شوہر کی کوشش میں مزاحمت نہ کرنا اس کی تائید اور شرکت سے کم نہیں۔ یہ درست کہ وہ بیوی تھیں، اطاعت اُن کا کام مگر اطاعت کے یہ معنی نہ تھے کہ جا و بیجا کا امتیاز ہی نہ رہتا اور ایک حق کی ادائیگی میں وہ دوسرے حقوق کو پامال کر دیتیں۔ نتھی نہیں، بچی نہیں، نواسے نواسیاں موجود۔ پوتے پوتیاں موجود میاں کو مائل کرنے کے بھی دن نہیں۔ خدا کو منہ دکھانے کا وقت تھا۔ ہماری بسر اوقات کا دارومدار اسی جائداد پر تھا۔ جب یہ نہ رہی، تو تکالیف ظاہر تھیں۔

کھانے کے بھی لالے ہو گئے۔ اب ہمارے پاس صرف ایک مکان رہ گیا تھا۔ جس میں ہم رہتے تھے۔ عدالت کے ذریعہ سے یہ بھی ہم سے چھینا گیا۔ صبح کی نماز سے فراغت پاکر اماں جان جانماز پر بیٹھی تھیں کہ پھوپی جان ہنستی ہوئی آئیں۔ اُس وقت اباجان کے پاس ایک پیسہ بھی نہ تھا۔ وہ چھوٹے تھے اور پھوپی جان بڑی آگے بڑھے، شکریہ ادا کرنا چاہتے تھے کہ پھوپی اماں بولیں۔

"آج اللہ رکھے افروز کی سالگرہ ہے مہمان زیادہ ہیں تم جلدی سے مکان خالی کر دو۔"

اباجان اتنا سنتے ہی سٹ پٹا گئے۔ خاموش باہر نکلے تو عدالت کے اہلکار موجود تھے۔ انہوں نے بھی تقاضہ کیا۔ اندر آئے۔ اماں جان کی طرف دیکھا اور کہا "ناظر اور چپراسی مکان خالی کروانے آئے ہیں۔ چلو نکلو۔"

اماں جان نے اور میں نے مل جل کر اسباب سمیٹا جس روز سے دادجان کا انتقال ہوا تھا اور پھوپا جان نے یہ ترکیبیں شروع کی تھیں۔ اسی روز سے ابا جان صدمہ میں گھل رہے تھے۔ یہ دنیا نہیں عالم ارواح ہے، اور میں کیوں نہ کہوں ہم تینوں رات سے بھوکے تھے۔ اباجان کی حالت تو پہلے بھی یہ تھی کہ دن رات اپنی بدنصیبی اور بہن کے مظالم پر روتے اُن کو بہن کی محبت بھی اتنی تھی کہ اماں جان کا دو ہزار کا زیور یہ سن کر کہ بہن تکلیف میں ہے قرض کے طور پر اُن کو دے دیا تھا۔ جو پھر واپس آنا نصیب نہ ہوا۔

مکان کے چپے چپے اور کونے کونے نے اباجان کے قدموں سے آنکھیں ملی تھیں وہ اسی گھر میں پیدا ہوئے اور بڑھاپا آیا، اس وقت اس حالت میں کہ سانس کے سوا کچھ نہ تھا۔ اور ڈھانچ باقی تھا حقیقی بہن کے ہاتھوں یہ صدمہ ایسا بیٹھا کہ ہوش جاتے رہے۔ جب ہم اس گھر سے نکلنے لگے، تو اباجان لڑکھڑائی

ٹانگوں سے بہن کے پاس پہنچے اور کہا۔

"اچھا آپا جان گھر مُبارک ہو۔ میں جاتا ہوں مگر کیوں آپا کیا میں تمہارے باپ کی اولاد نہ تھا۔"

آگے آگے ابا جان تھے، ان کے پیچھے میں اور اماں جان۔ اُس وقت ابا جان کی آنکھ سے زار و قطار آنسو بہہ رہے تھے۔ اور وہ حسرت بھری نظروں سے مکان اور مکان کی دیواروں کو نہیں اُس عورت کے چہرے کو دیکھ رہے تھے جو اُن کے دودھ کی شریک تھی۔ جس نے اُن کی ماں کے پیٹ میں پاؤں پھیلائے اور جس کے کان میں ماں کے آخری الفاظ جس کے بعد ماں کی زبان ہمیشہ کو بند ہو گئی وصیت یا امانت بہ موجود تھے کہ "بیٹی چھوٹے بھائی کو بچّوں کے برابر سمجھنا اور اِس کو پیٹھ نہ دکھانا۔"

ابا جان کی وہ نگاہیں جو اس وقت بہن سے رحم و کرم کی ملتجی اور شفقت کی خواستگار تھیں، ناکام واپس ہوئیں اور جب اُنہوں نے دیکھا کہ سنگ دل بہن، ماں اور باپ دونوں کی شفقت فراموش کر چکی، اور آگے بڑھ کر شوہر سے کہنے لگی کہ "اس مکان میں سفیدی کی ضرورت ہے۔" تو اُنہوں نے پھر بہن کی طرف رُخ کیا۔ اُن کا دل بھر آیا۔ اور آنسو کے قطرے متواتر لڑیاں بن چکے تھے، وہ محبت کے ہاتھ بہن کی گردن میں ڈال کر اُن کے سینے سے چمٹ گئے۔ گو اِس منظر کے دیکھنے والے آج قبروں میں پہنچ گئے ہوں گے مگر چمکتا ہوا آفتاب اور ہوا کے جھونکے جنہوں نے اپنی تیز نگاہوں سے مظلوم بھائی کو سنگ دل بہن سے لپٹے ہوئے دیکھا، ابھی دنیا میں موجود ہیں! انسانی کان فنا ہو چکے ہوں مگر زمین شاہد ہے کہ آسمان اُس وقت لرز رہا تھا۔ جب ہوا نے بدنصیب بھائی کے یہ الفاظ گود میں لیے۔

"میاجانی! اس مکان میں میرا اور تیرا دونوں کا نال گڑا ہوا ہے اباّ اور اماّں
کی پاک روحیں اسی سرزمین سے عالم بالا کو سدھاریں یہ اُن مٹنے والوں کی یادگار
ہے جن کی صورتیں اب نظر نہ آئیں گی، آپا دونوں تھرا اُٹھیں گے اگر مجھ کو
نکال کر اس میں کرایہ دار آباد کیا۔"

پھوپی جان کیا جواب دیتیں یہ کہنا مشکل ہے۔ اُن کی زبان خاموش تھی
گو ماں کے دودھ کا اثر اُن کے چہرے پر نام و نشان کو نہ تھا۔ مگر ان کا دل پسیجا
ان کی آنکھیں ڈبڈبائیں وہ ساکت تھیں، کہ پھوپا جان نے اباّ جان کے وہ ہاتھ جو
آج ۲۵ سال بعد ماں کے بدلے بڑی بہن کو ماں سمجھ کر اُن کے گلے میں تھے جھٹک
دیئے۔ سر پر دادا جان کی تصویر تھی۔ اباّ جان کی مایوس نظر اُدھر پہنچی اور حالتِ
اضطراب میں زبان سے یہ الفاظ ادا کئے۔

"میں یہاں سے رخصت ہوتا ہوں فی امان اللہ۔"

جائداد اس طرح گئی زیور اس طرح۔ جب آمدنی کے ذرائع نہ رہے تو روپیہ
آتا کہاں سے۔ مختصر سا مکان کرایہ پر لے کر ہم تینوں چاہیے یہاں متواتر تکلیفوں اور دقتوں
نے اباّ جان کی اور بھی رہی سہی کمر توڑ دی۔ اور اب اُن کی یہ کیفیت تھی کہ گوشت
کا ایک بے جان لوتھڑا پڑا ہوا ہے۔ جس حلق میں قورمہ کا لعاب بھی مشکل سے
اترتا تھا، اب اُس کو ڈھبر ڈھبر شوربا بھی غنیمت تھا۔ جو آنکھیں اچھے خاصے
پلاؤ کو کچا پکا کہہ کر دسترخوان سے اُٹھا دیتی تھیں۔ اب اُن کو معمولی خشکہ بھی امرت
تھا۔ وقت نے اب ہم کو زندگی کی اس منزل پہ پہنچا دیا کہ روٹیوں کے بھی لالے پڑ گئے
جب وہ وقت آیا کہ ایک روز دونوں وقت صبح اور شام ہم پر صاف گذر گئے
اور پہاڑ سا دن محض پانی کے قطروں پر ختم ہو گیا۔ تو غروب آفتاب کے ساتھ
میرے باپ کا وہ بدنصیب مجسمہ جو حقیقی بہن کے ہاتھو تباہ و برباد ہو چکا تھا

اور جس سے اب طاقت و توانائی رخصت ہو چکی تھی روتا ہوا اُٹھا اور لکڑی ٹیکتا ہوا باہر نکل گیا۔

(۷)

حق یہ ہے کہ عارف کے دوسرے نکاح نے وسیم دُلہن کی اُمنگیں اور خواہشیں کبھی کی ختم کر دی تھیں، اس کے پہلو میں دل ضرور تھا مگر وہ دل جس میں حسرت و نامرادی کے سوا کسی دوسری چیز کا گذر نہیں۔ اسلام کی جُدائی نے اب اِس نامُرادی میں ایک ایسی آگ سُلگا دی جس کا دُھواں رہ رہ کر اُٹھتا اور شعلے ختم ختم کر بھڑکتے۔ چار بجے کے قریب جب چاند کا روشن چہرہ اور بزمِ انجم پھیکی پڑنے کو تھی وہ ٹکٹکی باندھے اِدھر اُدھر دیکھ رہی تھی، اُس کو اس وقت ہوش مطلق نہ تھا۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ چاند ابر میں پھٹ پھٹ کر نکل رہا ہے۔ عالمِ خیال میں دماغ نے یقین دلایا کہ عنقریب چاند کے بدلے اسلام کی پیاری صورت بادل میں سے نکلے گی۔ دِل جو اس کی جُدائی کو ابدی سمجھ چکا تھا اِس یقین کے ساتھ اچھل پڑا۔ اس نے دونوں ہاتھ پھیلا دیئے اور کہنے لگی۔

"آ اسلام میری گود میں، چوٹ نہ لگ جائے"

یقین و استغراق کی حالت یہ تھی کہ آنکھ ہٹنے کا اور پلک جھپکنے کا نام نہ لیتی تھی۔ دو پھیلے ہوئے ہاتھ مامتا کے جوش میں غیر معلوم جنبش کر رہے تھے کہ دفعتاً ابر غلیظ کے ٹکڑے نے چاند کو آغوش میں لیا ہوا میں صبح کی خنکی پیدا ہو چکی تھی اور تارے ایک ایک دو دو کر کے رخصت ہونے شروع ہو گئے تھے۔ وسیم دُلہن انگنائی میں وداعِ شب کا منظر دیکھ رہی تھی کہ بادل پھٹا جس کے ساتھ ہی بدنصیب ماں کی توقعات میں کامیابی کا اضطراب اور ترقی کر گیا۔ نگاہ جمی ہوئی تھی کہ

دفعتاً آسمان سے ایک انسانی صورت نیچے اُترتی دکھائی دی۔ اُچھلنے کی کوشش کرتی تھی۔ لپٹنے کی تجویز کرتی تھی۔ بڑھنے کا خیال کرتی تھی کہ وہ صورت قریب پہنچ گئی۔ جس کو دیکھتے ہی ماں کا اضطراب خواب سے، توقع دہشت سے اور محبت ڈر سے بدل گئی۔ تھر تھر کانپنے لگی۔ رعشہ پڑ گیا۔ گھگھی بندھ گئی۔ !دیکھتی کیا ہے۔ نسیمہ جس کو دنیا سے اُٹھے مدتیں ہو چکی تھیں دانتوں میں اُنگلی دبائے اس طرح سامنے کھڑی ہے کہ آنکھ سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی ہیں۔ چاہا کہ جُھک کر سلام کرے مگر رُعب اس قدر چھایا ہوا۔ حالت اس قدر بگڑی ہوئی تھی اور حواس اس حد تک غائب تھے کہ کوئی عضو اختیار میں نہ تھا۔ ارادہ کرتی تھی کہ چیخوں مگر خوف یہاں تک ترقی کر گیا تھا کہ آواز بھی نہ نکل سکتی تھی، رات چاندنی تھی مگر کچھ ابر کا اثر، ماہتاب کا وقت رخصت چادرِ مہتاب میلگجی سی تھی لیکن اِس نورانی صورت کے نزول سے انگنائی اور دالان کمرہ اور سائبان ہو رو دیوار تک منور تھے۔ شب قدر کا سا عالم تھا کہ ہر سمت مہتاب چھٹ رہی تھی۔

وسیم دُلہن متحیر و ششدر کھڑی تھی کہ نسیمہ آگے بڑھی اور کہا۔

بیٹی! آنکھیں آسمان سے زمین تک چھڑکاؤ کرتی اور بدنصیب نسیمہ خدا کے گھر سے تیری ناپاک دہلیز تک روتی پیٹتی آئی ہے! پیوند زمین ہو جاتی تجھ جیسی ناشاد نامراد اس سے پہلے کہ تیرے ہاتھوں عالم بالا کی مطئن روحیں تیرے بچّہ کی بربادی کا مرثیہ پڑھیں! او نمک حرام ہستی تیرا صدمہ اس وقت بھی اپنی مامتا اور محبت کا ہے۔ تجھ کو نہیں معلوم کہ تو نے وہ ستم کیا جس کی تلافی، وہ ظلم کیا جس کا معاوضہ وہ قیامت ڈھائی جس کا بدلہ ناممکن، محال مشکل! محشر برپا ہو جاتا، اُس گھڑی جب تجھ جیسی ناہنجار عورت وسیم کے نکاح میں آئی۔ زمین پھٹتی تو سماتی آسمان ٹوٹتا اور تو دبتی، بجلی گرتی اور تو جھلستی اُس وقت جب تو بیٹی سے بہو

اور لڑکی سے بیوی بنی! سادات کی آبرو ماند کرنے والی بہو! زاہد اور حسنین جیسے بزرگوں کے مقدس ناموس کو خاک میں ملا دینے والی عورت! دنیا تجھ پر لعنت اور فرشتے تجھ پر ملامت بھیج رہے ہیں۔ جس خاندان کے لڑکوں پر لڑکیاں قربان کیں آج اُس کا ایک لڑکا تجھ ناشدنی اور نمک حرام کی بدولت حبس دوام کی سزا بھگت رہا ہے۔ منصور منزل کی چوکھٹ پر پچاس سال میں تین بہوؤں کی پالکیاں اُتریں۔ پہلی اماں جان۔ دوسری میں تیسری تو۔ دو مر چکیں، اور تو زندہ ہے۔ مرنے والیاں نہ ہوں، لیکن اُن کے دیکھنے والے ابھی ہیں۔ پوچھ بتائیں گے، سُن سُنائیں گے، اور دیکھ دکھائیں گے، سننے والے کان، دیکھنے والی آنکھیں اور بولنے والی زبانیں کہ فنا ہونے والی ہستیوں نے کس طرح سُسرال کو چار چاند لگا کر باپ دادا کی لاج رکھی سُسرال پر میکہ، پڑوس پر گھر اور غیروں پر اپنے قربان کر دیئے مگر بزرگوں کی بات پر حرف نہ آنے دیا۔ گھروں سے جنازے نکل نکل گئے، مگر زبان سے غلط بات نہ نکلی!

قسیم جیسا انسان جس کی انسانیت کا ڈنکا آج بھی دُنیا میں بج رہا ہے اماں جان ہی کی گود کا طفیل ہے تیرا شوہر وسیم جس کو عزیزوں کی نہیں غیروں کی آنکھیں اب تک رو رہی ہیں جس کا دسترخوان مرنے کے بعد بھی دونوں وقت یتیموں کے روبرو بچھ رہا ہے مجھ ماں کی تربیت کا معمولی نمونہ تھا۔

تُو بھول نہیں سکتی وہ راتیں اور وہ دن جب میں نے اپنا سکھ اور چین تیرے لال پر قربان کیا۔ میں اُسے رات رات بھر کندھے سے لگائے ٹہلی اسلام تیری ملکیت نہیں امانت تھا، او خائن بہو! او ڈائن ماں! اگر ذرہ بھر صداقت کا ظہور موجود ہے تو بول اور بتا۔ باپ نے اِسی دن کو دادا نے اسی روز کو اور میں نے اِسی وقت کو اپنی جانیں لڑائی تھیں کہ پھولوں پر سونے والا اسلام

تجھ ناہنجار ماں کی جہالت کا شکار ہو کر جیل خانہ کی زمین پر سوئے اور جس جسم پر زربفت اور کم خواب کے کپڑے پھٹے ہوں آج اُس کا پیراہن ٹاٹ اور کمبل ہو! تیرا رنج فضول، تیرا غم بے کار، تیرا رونا عبث، تیرا اضطراب غلط، تونے جو بویا وہ کاٹا، جو دیا وہ ملا، جو ڈالا وہ پایا، تیری ہستی شروع سے آخر تک، تیری زندگی ابتدا سے انتہا تک، اور تیرا جسم سر سے پاؤں تک دغا کا گھر اور فریب کی جڑ ہے شوہر کے افتراق پر بچہ کے فراق پر عارفہ کے نکاح پر اسلام کی سزا پر تیرا صدمہ مکر تیرا رنج فریب، تو اس کی مستوجب اور اس کی سزاوار۔ بدنصیب عورت ابھی اعمال کی سزا افعال کا نتیجہ بہت کچھ بھگتنا ہے۔ بھول مت اُن مظالم کو جو توڑے اُن زیادتیوں کو جو کیں، اس بے رحمی کو، اُس سنگ دلی کو، اُس نخوت کو، اُس تمکنت کو جس سے معصوم روحیں لرزیں اور کانپیں، تھرائیں اور چلائیں رہنے والی نہ تھی وہ طاقت جس نے بدنصیب فاروق کے ہاتھ سے خون کی تلی بہادی۔ بن ماں کا بچہ۔ بیکس اور بے بس تیرے قبضہ میں ضرور تھا۔ تیری طاقت فاروق سے زیادہ یقینی تھی۔ مگر ایک قوت تجھ سے بھی زبردست موجود تھی۔ لے بی بی آٹھ برس کا بچہ تیری حکومت کے آگے اپنا دکھ بھول گیا۔ تونے بچوں والی ہو کر معصوم کے ہاتھ سے خون بہتا دیکھا اور تیرا دل نہ پسیجا جس خون نے فرشتوں کے دل لرزا دیئے، حوروں کی آنکھیں ڈبڈبا دیں، تونے اپنی آنکھ سے اُسے دیکھا اور منہ پھیر لیا۔ تیری نگاہ میں وہ خون بے حقیقت ہو۔ مگر اے بدنصیب اُس خون کا ہر قطرہ اور آنکھ کا ہر آنسو زمین پر نہیں عرش معلی پر گر رہا تھا۔ کیا دل کہہ رہا ہوگا اُن بچوں کا جو کڑکڑاتے جاڑوں میں بیٹھے باورچی خانہ میں سُکڑ رہے تھے۔ رات اندھیری تھی تیرے بچے کلیجہ سے چمٹے ہوئے تھے اُن کے ننھے ننھے ہاتھ ایک دوسرے کی گردن میں پڑے ہوئے۔ دنیا اُس رات کو

فراموش کر جائے مگر تیرے اعمال نامہ میں وہ رات چاند کی طرح روشن ہے، یہ سر جس نے ایک مرتبہ بھی سجدہ نہ کیا، یہ دل جو ایک لمحہ خوفِ خدا سے نہ ڈرا، یہ آنکھ جو ایک مرتبہ بھی کسی مظلوم پر نہ روئی، اپنے اعمال کی سزا بھگتیں گے، اپنے کیئے کا نتیجہ پائیں گے۔ اپنی غفلت کا مزہ چکھیں گے۔

جو ہو گیا وہ خبر نہیں اور جو ہوگا وہ خدا جانے۔ مگر اتنا جانتی ہوں کہ جس کو بے کس سمجھا وہ وارث والا تھا۔ جس کو تنہا جانا وہ اکیلا نہ تھا۔ جو کرنا تھا وہ کیا۔ کر لیا اور کر چکی مگر اب بے کس کا وارث مظلوم کا حمایتی اٹھا ہے۔ بتلائے گا۔ اور دکھائے گا کہ کمزور کیسی طاقت اور لاچار بھی کچھ طاقت رکھتے ہیں۔

اسلام کی سزا اس غضب کا جو ٹوٹنے والا ہے، اس آفت کا جو آنے والی ہے ایک ذرہ بھی نہیں۔ یہ تو بوئے ہوئے بیج اور لگائے ہوئے پودے تھے تیار ہو اس مصیبت کے لئے جو اٹل ہے، اس وقت کے واسطے جو یقینی ہے۔ اس دقت کے لئے جو برحق ہے۔

معلوم ہے کیا تھا اور کیا کیا۔ ہاتھ معصوم کا نہیں طاقتور کا، انگلیاں کمزور کی نہیں زبردست کی، دل یتیم بے کس کا نہیں شہنشاہِ حقیقی کا اور خون کے قطرے فاروق کے نہیں خدا کے تھے۔ جو تیرے ہاتھوں نے گرا لئے اور آہ نہ کی، تیری آنکھوں نے دیکھے اور میل نہ آیا۔ تیرے دل نے گوارا کیا اور کروٹ نہ لی۔ معاملہ بے وارث کا نہیں شہنشاہ دوسرا کا ہے۔ توتلی زبان کا جواب "اچھی اب نہیں" نکل کر ختم ہو گیا۔ اور تو ہنس کر خوش ہو لی مگر۔ پورا جواب ایک اور آواز دے گی۔ بھولی آنکھوں کے آنسو جو لرز لرز کر نکلے، بے گناہ سینے کا سانس کانپ کانپ کر باہر آیا وہ بکھ چکی۔ آنسوؤں نے جو بیج ڈالے، آہوں نے جو ہوا بن کر سینچا وہ کھیتی زمین پر نہیں آسمان پر تھی۔ اب اُن پھلوں کو توڑ چکھ اور

کھا، اُٹھا اور بھگت۔

موت زندوں کے لئے سبق اور مصیبت دیکھنے والوں کے لئے عبرت ہے۔ عمر گذشتہ تجھ کو بتا اور دنیا کو دکھا دے گی کہ راحت و الم بسا اوقات عورت کے اپنے اعمال ہیں۔ دوسروں کو ہنسانے والی ہستیاں اور خوش کرنے والے انسان حق رکھتے ہیں کہ ہنسیں اور منتظر رہیں کہ خوش ہوں گے لیکن دُکھ دے کر سُکھ پانے والی آنکھیں آج نہیں کل اور کل نہیں پرسوں آنسو گرانے والی ہیں کائنات کا مطالعہ پھونک اور دوسروں کا تذکرہ چھوڑ، نظر ڈال اپنے افعال پر جو کرتی رہی وہ پاتی رہی، جو دیتی رہی وہ لیتی رہی۔ فاروق کا خون تو بھول چکی ہو مگر یاد رکھ کہ وہ ابھی تازہ ہے اور رنگ لانے والا ہے۔ وہ چند قطرے کچھ قیمت، وہ ننھی سی آہ کچھ اثر اور معصوم نگاہ کچھ معنی رکھتی تھی، وہ قطرے رائیگاں، وہ آہ خالی اور وہ نگاہ بے کار نہ ہو جائے گی اسلام کا ریخ کر چکی، اب اپنا فکر کر اور سُن لے۔ موت تیری تاک میں، مصیبت تیری فکر میں اور دوزخ تیرے انتظار میں ہے، قبض روح کا وقت مقرر ہو چکا ہے مصیبت بھاگم بھاگ آ رہی ہے۔ اور دوزخ کے شعلے بھڑک اُٹھے ہیں۔ غنیمت سمجھ کہ ابھی پردے میں بیٹھی ہے، اور گھر میں کھڑی ہے۔ مگر آ رہا ہے وہ وقت کہ فاروق کا خون جیتے جی موت کا مزہ چکھا دے گا۔ دیہیم دُلہن! دَر دَر کی ٹھوکریں گھر گھر کی بھیک ہو گی۔ اور جس ہاتھ سے بے گناہ معصوم کی ننھی ننھی انگلیاں ذبح کیں اُس میں زخم اور زخموں میں کیڑے ہوں گے۔

وعدہ نہیں اور نہ وعدہ کا حق، صلاح ہے اور وہ بھی محض دوستانہ کہ اپنے کلیجہ کے ٹکڑے اُس بدنصیب ماں کے لال پر جس کی ہڈیاں تیری نگاہ میں گل کر خاک ہو چکیں مگر حقیقتاً جس کے آنسو آج تک جنت میں تھے قربان کر فاروق

کے قدموں پر سر رکھ اُس کو کلیجہ سے لگا۔ اور اُسی دل سے جس کو دکھا چکی ہے دُعا لے۔ یہ وعدہ ہے اور اس لئے کہ شب و روز کا تجربہ ہے اگر فاروق کے مجروح دل کی کلی کھلا دی تو دُنیا کے عذاب اور آخرت کی مصیبت دونوں ہلکے ہو جائیں گے۔"

(۸)

"ہاں بیوی اب وہ وقت آتا ہے کہ گو تم فطرت انسانی کے تمام مراحل طے کر چکیں، مگر چونکہ پہلو میں ایماندار دل موجود تھا اس لئے تھرا اٹھا گی کہ کیسے کیسے انسان قضائی دُنیا کا گنجینہ ہیں۔ یہ میں ابھی کہہ چکی ہوں کہ انتہائی صدمات نے وقت کے ساتھ ابا جان کی بصارت بھی کم کر دی وہ دن کو ٹٹول ٹٹول کر چل پھر بھی لیتے تھے۔ مگر رات کو ایک قدم بھی چلنا مشکل تھا، دو وقت کا فاقہ اور تین آدمی دو عورتیں ایک مرد اس کے سوا ہو ہی کیا سکتا تھا کہ وہ خود رزق کی تلاش میں اور فکرِ معاش میں نکلتے۔ محنت کے قابل نہیں، مزدوری کے لائق نہیں ایک بھیک ہی ایسی چیز تھی کہ ہم بدنصیبوں کے پیٹ میں ٹکڑا ڈال دیتی۔ یہ تو ابا جان ہی کا دل جانتا تھا کہ جس کے ہاتھ روپے اور اشرفیوں سے بھرے رہے اُس کے دل پر جب وہ بھیک کا قصد کر رہا تھا کیا گذر رہی ہو گی۔ اگر زکوٰۃ کوئی حکم اور خیرات کوئی چیز ہے، صدقہ کچھ معنی رکھتا ہے تو تیرے باپ سے زیادہ اس وقت کون مسلمان مستحق ہو گا، مگر افسوس کہ ہمارا ہی طبقہ نسواں اس غلطی کا ذمہ دار ہے مسلمانوں میں جس بُرے طریقے سے خیرات ہو رہی ہے اس کا بار مردوں پر کم عورتوں پر زیادہ ہے۔ ہٹے کٹے مسٹنڈے بڑے

بڑے شہروں میں ۱۲ بجے رات کو اُٹھ کر کوئی بے نمازوں کا رسالہ. کوئی ہرنی کا معجزہ کوئی کربلا کے شعر اور کوئی مدینہ کی مناجات پڑھ کر جیبیں سے جھولیاں بھرتے ہیں۔ مردوں کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں ہوتی اور بیبیاں نہ معلوم خدا کا مقدس فرشتہ یا جنت کا داروغہ سمجھ کر نہایت فراخ دلی سے اُس کی مدارات کرتی ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مکاروں کی ہمت اور بڑھی اور تعداد اتنی ترقی کر گئی کہ دینے والوں کو مستحق اور غیر مستحق کا امتیاز ہی نہ رہا۔ اور بدمعاشوں کے ساتھ واقعی مستحق بھی گھن کی طرح پس گئے۔ ابا جان بدقسمتی سے ایسے محلہ میں جا پہنچے جہاں سب تعلیم یافتہ خواتین آباد تھیں اور چونکہ ان کے کان میں یہ بھنک پڑ چکی تھی کہ اس قسم کے سائل مکار ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ ایسے لغو سائلوں کی التجا پر کان نہ دھرتی تھیں۔ ابا جان نے کئی دروازے کھٹکھٹائے مگر کسی سے ایک پیسہ یا چٹکی بھر آٹا نصیب نہ ہوا۔ اس عرصہ میں رات کے دس بج چکے تھے۔ ہر طرف ناکامی ہوئی تو ابا جان باہر نکلے۔ اب انہوں نے اُس آواز کو جس کے چھپانے کی اب تک کوشش کرتے رہے علی الاعلان نکالنا شروع کیا۔ اُن کی کمر جھک گئی تھی اُلٹے پاؤں میں لکڑی کا سہارا لے کر سیدھا ہاتھ پھیلا دیا۔ وہ سوال کرتے چلے جا رہے تھے کہ ایک اللہ کے بندے نے ہاتھ پر پیسہ رکھا اور لکڑی پکڑ ایک گلی میں چھوڑ دیا۔ یہاں اُن کے کان میں آدمیوں کے شور و غل کی آواز آئی معلوم ہوا کہ ایک گھر میں شادی ہے اور مولود شریف ختم ہو کر اب غربا کو کھانا کھلایا جا رہا ہے۔ اِس علم نے ابا جان کو باغ باغ کر دیا اور وہ شادی کا پتہ پوچھتے پوچھتے وہاں تک پہنچے۔ بی جان موجود نہ تھی۔ مگر جو حالات معلوم ہوئے ہیں۔ اُن کا خلاصہ یہ ہے کہ لوگ کھا کھا کر باہر نکل رہے اور اندر جا رہے تھے۔ یہ بھی ایک وقت تھا کہ

جس شخص نے ایک ایک دن میں بیسیوں روپے بے دریغ خرچ کر دیئے آج اس کی انتہائی آرزو تین چار روٹیاں تھیں۔ رات بسرعت تمام اُڑی چلی جا رہی تھی اُس وقت کا ہر لمحہ میرے اور اماں جان کے خیال میں ابا جان کے دل پر نشتر کا کام کر رہا تھا۔ اُن کی تمام آرزوئیں، تمام حسرتیں، تمام خواہشیں صرف اس کوشش میں محدود تھیں کہ زیادہ نہیں وہ صرف دو آدمیوں کا کھانا لے کر آجائیں اور ہمارے پیٹ بھر دیں۔ میں جانتی ہوں کہ اُن کی آرزوئیں غلط، اُن کی حسرت جھوٹی اُن کی خواہش بے جا۔ وہ اندھے ہوئے تو کسی کو کیا اور بھوکے تھے تو مسلمانوں کی بلا سے۔ ان کو کوئی حق نہ تھا کہ وہ اپنی مصیبت کا حال سُنا کر چہ نچال دلوں کو رنجیدہ کریں۔ مسلمان اگر مسلمان تھے تو اس واسطے تو نہ تھے کہ اپنی خوشی کی گھڑیاں بدنصیب حاجتمندوں کے مصائب سے منغص کر دیں۔ اپنی گاڑھی محنت کا کمایا ہوا روپیہ زکوٰۃ یا خیرات کے بہانے مفت خوروں کے بھینٹ چڑھائیں۔ بقول میری عزیز سہیلی مسز لے حسن کے کہ خاموشی کے ساتھ خیرات کرنا ہرگز اسلام کا حکم نہیں ہو سکتا۔ جب تک چندہ کی رقم علی الاعلان نہ دی جائے۔ دوسروں کو ترغیب ہو ہی نہیں سکتی۔ خیر ابا جان کی پہلی غلطی تو یہ تھی، دوسری یہ ہوئی کہ اپنی غرض میں دیوانہ ہو کر اور یہ نہ سمجھ کر کہ مکان مردانہ ہے یا زنانہ، اندر گھس گئے۔

مصیبت کا انتہائی وقت تھا، رات آدھی کے قریب گذر چکی تھی اور اُس کے ساتھ ہی اُس شخص کی توقعات سوال بھی قریب قریب ختم ہو رہی تھیں۔ جس کو بڑا اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کی اس جماعت میں یقیناً میرے شناسا ہوں گے۔ اور جو کل میرے ساتھ برابر کے بیٹھنے والے تھے مجھ کو اس حالت میں دیکھیں گے۔ لیکن ضرورت نے عزت اور حمیت سب ختم کر دی۔ مکان مردانہ

ہی تھا، اور اباجان کا قیاس غلط نہ تھا لیکن مکان دنیا والوں کے واسطے، انتظام ہمچشموں کے لئے اور کھانا برابر والوں کے لئے تھا نہ کہ اللہ والوں کے لئے، فقیروں اور کمزوروں کے لئے! اباجان کا قدم دھرنا تھا کہ چاروں طرف سے لوگ چیخ پڑے اور آواز سنتے ہی کہنے لگے "نکالو۔ باہر نکالو۔ کسی فقیر کو اندر نہ آنے دو۔"

اس چوکھٹ میں دو مکان تھے۔ ایک مردانہ ایک زنانہ، اباجان مڑے تو زنانہ مکان کے دروازہ میں ایک بیوی تھانہ دار صاحب کے واسطے جو اُسی وقت تشریف لائے تھے خصوصیت کے ساتھ خوان لئے کھڑی کسی مرد کا انتظار کر رہی تھیں، اباجان آنکھوں سے معذور تھے ٹکر لگی اور بھرا ہوا خوان گر پڑا ایک اندھے کی ایسی عظیم الشان غلطی کی ذمہ داری گھر والی پر نہ تھی بیچاری کھانا نکال کر لائی تھی۔ ادہر کا سالن، تہہ دیگی کی بریانی، بیوی ایک لونڈی ایک ماما اور ایک مرد، چار آدمی تھپڑ گھونسا لات اُن پر ٹوٹ پڑے۔ اندھے تھے تو ان کو کیا اور حاجتمند تھے تو ان کی بلا سے، ہٹ کر باہر نکلے تو سر چکرا رہا تھا۔ سیڑھی پر سے پاؤں رپٹا دھڑام سے نیچے گر کر بیہوش ہو گئے۔ پہلے تو ایک دو آدمیوں نے ہُشیار کرنے کی کوشش کی آوازیں دیں پھر ایک شخص نے ٹانگ گھسیٹ کر الگ ڈال دیا کہ رستہ نہ رُکے۔ سُنا ہے کہ ایک بجے کے قریب گھر والی کسی بیوی کو روشنی ساتھ لے کر دروازہ تک پہنچانے آئیں تو چہرہ پر نگاہ پڑی اور معلوم ہوا کہ وہ اندھا فقیر جس کو مار پیٹ کر اُنہوں نے دھکیلا تھا وہ اُن کا حقیقی بھائی تھا جس کا مکان چھینے کی خوشی میں آج مولود شریف اور دعوتِ عام تھی!!

پھوپاجان غیر تھے ہم کو اُن سے شکایت نہیں۔ افسوس پھوپی جان پر

ہے حقیقی بہن ہو کر ایسی سنگ دل کہ یزید اور شمر کو بھی مات کیا۔ لاکھ شوہر کی عادت اور خصلت سے مجبور و معذور مگر ایمان رکھتی تھیں، سوچتیں، کیا کیا کر رہی ہیں۔ خیر ہم اُن کی اسی عنایت کے ممنون ہیں کہ اُنھوں نے ڈولی کر تین آدمیوں کا حصہ رکھ اباجان کو گھر بھجوا دیا۔ سچ پوچھو تو یہ کھانا ہم دونوں ماں بیٹیوں کے واسطے زہر تھا اور ہم کو مر جانا چاہئے تھا کہ ہماری وجہ سے اس شخص نے جو باپ اور شوہر ہے اپنے فرائض کو کس طرح ادا کرنے کے بعد یہ کھانا حاصل کیا۔ ہائے دُنیا اور دُنیا کا تعلق! دہی کھانا جو بھیک مانگ کر، دھکے کھا کر پٹ کر بے ہوش ہو کر ذلیل ہو کر، غیرت کھو کر اباجان لائے، بیوی اور بیٹی دونوں نے زہر مار کیا!! البتہ جس وقت ہم کھانا کھا رہے تھے۔ اتنا ضرور سوچتے جاتے تھے کہ افسوس ہماری غفلتوں اور غلطیوں پر مردوں کی جس کمائی کو ہم ایسی بے رحمی سے برباد کرتے ہیں وہ کیسی کیسی مصیبت اور آفتوں سے پیدا ہوتی ہے۔ خدا ایسی کمائی تو دشمن کو نہ دے لیکن اس سے پتہ ضرور چل گیا کہ مرد ہماری زندگیوں کے واسطے اپنے فرائض کس طرح ادا کر رہے ہیں۔

ماموں جان جب ضلعدار تھے، ایک دفعہ ان کو صاحب نے بیوقوف کہا، سُنتے ہی سناٹا آگیا۔ قسمیں کھاتے تھے کہ اگر جینوں کا بھی سہارا ہوتا تو نوکری پر لعنت بھیجتا مگر کیا کروں بیوی بچوں کی بیڑی پاؤں میں ہے۔

اباجان جس وقت باہر گئے ہیں اماں جان وضو کر رہی تھیں۔ ہم نے پوچھا نہ اُنھوں نے بتایا کہ کہاں جاتے اور کیوں جاتے ہیں۔ جھوٹ کیوں بولوں میرے پیٹ میں جو ہے فلایا زبان کھا رہے تھے خوب ڈٹ ڈٹ کر کھایا۔ مگر اماں جان اباجان کی کیفیت سُن اور حالت دیکھ کر جلکرا کر بیٹھ گئیں اور اباجان کے کہنے سے شریک تو ہو گئیں مگر آنکھوں سے ساون بھادوں کی جھڑیاں بہہ رہی تھیں۔ مجھے تعجب تھا کہ

جس بیوی نے جوانی بڑھاپے سے بدل دی اور تیوری کا بل نہ بدلا، آج وہ شوہر کے قدموں کی خاک تھی۔ میں تو میں خود ابا جان حیران تھے کہ جو بیوی تموّل میں اپنی وضع کی اس قدر پابند اور اتنی خوددار کہ منت اور خوشامد تو درکنار بات بھی دب کر نہ کی وہ اس وقتِ مفلسی اور مفلسی کیوں فاقہ اور مصیبت کے وقت قدموں میں بچھی جاتی تھی۔ جب میں اور ابا جان اپنے اپنے بچھونوں پر لیٹ گئے تو اب وہ وقت آیا ہے جب آسمان کے فرشتوں اور زمین کے درختوں نے دیکھا کہ جو بیوی بدمزاجی اور بددماغی کا پورا تمغہ دُنیا سے حاصل کر چکی تھی۔ وہ کس طرح ماں کے دودھ باپ کے خون کی لاج رکھ کر بتاتی ہے کہ مسلمان بیوی کیا ہے۔ نمازِ عشا سے فراغت پا کر اماں جان روتی ہوئی جانماز سے اُٹھیں۔ ابا جان اپنے افکار میں غرق تھے کہ دفعتاً اُن کے قدموں پر گریں اور سر اُن کے پاؤں پر رکھ کر کہا۔

"ماں کی دہلیز اور باپ کے گھر سے وداع کے بعد جس کو آج ۲۵ سال کے قریب ہوگئے، خدا نے مجھ کو شوہر کی بیوی، گھر کی گھر والی، بچّوں کی ماں بنایا، ہمارا نکاح میری تمہاری دونوں کی ضرورت تھی۔ سچ نہ تھی کہ مجھ کو تم پر اور تم کو مجھ پر ناجائز حکومت کا حق ہوتا۔ تم جب تک شوہر تھے میں بیوی تھی۔ تم دینے والے میں لینے والی، تم کمانے والے میں اُٹھانے والی، تمہارا ہاتھ جب تک اوپر اور میرا نیچے رہا۔ میں نے ایک تم کو نہیں دنیا کو دکھا دیا کہ ماں باپوں کی بیٹیاں لونڈیاں نہیں بیویاں ہیں، یہ آن پر جان اور عزت پر راحت قربان کرنے والی ہستیاں ہیں لیکن آج جب وقت نے تمہارے تموّل کو افلاس سے تمکنت کو خاموشی سے بدل دیا۔ تو میں بیوی نہیں لونڈی ہوں۔ یہ سر ان قدموں پر فدا، یہ جان اس صورت پر نثار، مجھے خبر نہیں تھی کہ ماں وہ ناشاد نامراد بچّی جن رہی ہے جس کا شوہر بھیک مانگ کر اس کا پیٹ بھرے گا۔ موت نعمت ہوتی اگر اس سے پہلے میرا بردہ

ڈھانک دبی کہ میں یہ سماں دیکھوں اور یہ ٹھکڑے کھاؤں ۔ دولت اور عزت قدرت کے کرشمے اور دنیا کے کھیل ہیں ۔ یہ ہرتی پھرتی چھاؤں کاغذ کی ناؤ ہے ۔ شریف بیبیاں باہر والی نہیں ۔ شریف ماں باپوں کی بیٹیاں ہیں ۔ یہ ساون کی چڑیاں ہری چگ نہیں ۔ رنج کی رفیق اور مصیبت کی شریک ہیں ، تکلیف ان کی شرافت کا امتحان اور خاندان کی آزمائش ہے ۔ مصیبت میں صبر ان کا زیور اور فاقہ میں شکر ان کا جوہر ہے ۔ جہالت یا لغویت مگر میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ عورت کی تقدیر کا رزق اور مرد کی اولاد ۔ میری بدنصیبی نے یہ دن تم کو دکھایا ۔ اس تکلیف کی وجہ ، اس مصیبت کا سبب اس انقلاب کا باعث میں اور صرف میں اور فقط میں شکر گزار ہوں کہ اس پر بھی تم نے میرے حقوق کا لحاظ رکھا اور مجھ جیسی نافرمان عورت پر وہ احسان کیا کہ اگر میں پاؤں دھو دھو کر پیوں تو معاوضہ محال اور اپنی کھال کی جوتیاں پہناؤں تو بدلہ مشکل ۔ ماں کے بعد اور باپ کے پیچھے جب زندہ بہنیں جیتے جاگتے بھائی حقیقی خالائیں اور سگے ماموں ایسے فرنٹ ہو گئے کہ مہینوں اور برسوں اپنی صورت دکھائی نہ میری دیکھی تمہارے دم سے تمہارے کرم سے ، عزت آبرو کے ساتھ گھر والی بنی اور بیگم کہلائی ۔ عمر بھر تمہاری بدولت راج کیا سونا ہاتھوں میں کھیلا اور چاندی قدموں میں لوٹی ۔ جو ہاتھ ہمیشہ زبر رہے وہ اس وقت زیر نہ ہوں گے ۔ ابھی میں زندہ ہوں اور ان ہاتھوں کا کرم میرے دل میں موجود ، جب وقت نے تمہارے بلند ہاتھ خاموش کر دیئے تو اُن کا منہ تکنے والے وہ ہاتھ جنہوں نے اُن کی بدولت کہنیوں تک سونا پہنا نمک حرام ثابت نہ ہوں گے ؛ آٹا پیسوں گی ، سلائی سیوں گی ، پسائی کروں گی مگر محسن کے ہاتھوں کو نیچا نہ ہونے دوں گی ۔"

بیگم کے اس جواب نے ابا جان کو محوِ حیرت کر دیا تھا ، اُن کو اماں جان سے اس قدر مایوسی

ہو چکی تھی کہ وہ اس منظر کو خواب سمجھ رہے تھے۔ یقین کے بعد اُنہوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور کہا "مجھے امید نہ تھی کہ اِس رنج میں جو صدمہ نہیں مرض الموت ہے تم اس طرح میری غمخوار ثابت ہو گی۔ میں اس قابل نہیں ہوں کہ تمہارے احسان کا معاوضہ کر سکوں، وقت نے مجھے اس قابل نہ رکھا کہ بھیک مانگ کر تمہارا پیٹ بھر دیتا۔"

اتنا کہہ کر ابا جان کی طبیعت کچھ ایسی بگڑی کہ وہ بات نہ کر سکے۔ اماں جان کی حالت اس سے زیادہ خراب تھی، انہوں نے ابا جان کے قدموں کو بوسہ دیا اور کہا۔

"یہ سر ان قدموں پر قربان! عیش اِن قدموں سے اور عزت اس دم سے ہے نادم اور شرمسار بیوی خطاوار گنہگار لونڈی معافی کی خواستگار ہے، دولت ختم ہوئی مفلسی رہنے والی نہیں، وہ دن نہ رہے تو یہ بھی نہ رہیں گے۔ خدا پر نظر کوشش پر بھروسہ اور تقدیر پر یقین کرو۔ دنیا کا وسیع میدان پیش نظر ہے۔ محنت کریں گے۔ اور پیٹ بھریں گے۔"

(۹)

خالق کی قدرت تو کیا مخلوق کی حماقت ہی سمجھو کہ جس قوم کے اکرام و اعزاز کا انحصار کبھی اتقا پر تھا اُس کی نگاہ میں آج روپیہ انسانیت کا جزو اور دولت شرافت کا لازمہ قرار دیا جائے۔ اس سے انکار مذہب کی توہین ہے گلشن اسلام کی جو بہار آنکھیں غریب کی جھونپڑی میں دیکھیں گی وہ قصرِ شاہی میں نظر نہ آئے گی مگر آج جو مسلمانوں کی نگاہوں میں مفلس اور نیچ ذات کے ساتھ متقی اور پرہیزگار ہو وہ ذلیلوں کا ذلیل اور رذیلوں کا رذیل نسترن مغلانی کی لڑکی اور غریب تھی

نگوڑس کے اعمال وافعال ایسے تھے کہ سو شریف اور ہزار بھلے مانس قربان۔ اسلام جس روز سے کالے پانی گیا مغلانی اور نسترن دونوں ماں بیٹیاں وقت کا بڑا حصہ وسیم دلہن کی تسکین کرنے میں گذار دیتیں۔ اُس کے ساتھ روتیں اُس کے پاس بیٹھتیں بہلانے کی کوشش کرتیں۔ بہلانے کی تدبیر کرتیں مگر اس کا زخم کاری تھا جو بارہ پہر اور چوبیس گھنٹے ہر وقت رس رہا تھا۔ وسیم جیسا شوہر قابل فخر اور لائق ناز، دیکھنے کے قابل اور دکھانے کے لائق، امر کر چھوٹا اور اسلام جیسا بچہ ہٹا کٹا موٹا تازہ، بیمار نہ علیل جیتے جی، اُس پہ جو گذری اور گذر رہی تھی، اُس سے اس وقت بحث نہیں ذکر نسترن کا ہے ذات کی درزن، نام کی سوکن مگر ایک دفعہ نہیں بارہا اُس کے درد میں اس طرح شریک ہوئی کہ رونے کی آواز گھر بھر نے سُنیں۔ یہ اُسی کا دل گردہ تھا کہ عارف جیسے شوہر کو جو بیوی کے نام سے متنفر اور صورت سے بیزار تھا، کہہ سُن کر بھیجتی اور زبردستی پہنچاتی، یہاں تک ہوا ہے اور کبھی کبھار نہیں کئی مرتبہ کہ عارف کچہری سے تھکا ہارا آیا۔ کھانا کھاتے ہی پلنگ پر لیٹا حقہ کی منال مُنہ میں رہی، خراٹے لینے لگا، نسترن بیٹھی جاگتی رہی، اس کی اگر آنکھ کھل گئی تو خیر ورنہ خود جگایا، اور کہا۔

"آج بڑے گھر کی باری ہے وہاں آرام فرمائیے۔"

بچہ قریب قریب ہمیشہ کو چھوٹ چکا تھا، سوکن مستقل گھر میں آبراجی تھی، مگر ہم پھر بھی کہیں گے کہ وسیم دُلہن خوش نصیب تھی۔ بچہ کا فراق اور سوکن کا وجود اگر صدمہ تھا اور اگر کیوں تھا، ضرور تھا، لیکن وہ ان دونوں میں ہماری یا کسی کی ہمدردی کی قطعاً مستحق نہیں۔ بچہ زبردستی گھر سے نکالا اور سوکن ڈولی بھیج کر گھر بلا لائی۔ اب بھی اگر وہ انسانیت سے کام لیتی اور شرافت سے چلتی۔ جو گذرنی تھی گذر گئی، جو گذرتی اچھی گذرتی مگر احسان فراموش اس حالت اور مصیبت میں بھی دن رات اُس کے خاندان کو اُگلتی رہتی۔ کُھلم کُھلا اور علی الاعلان کہتی اور ڈنکے کی چوٹ کہتی کہ

"اِس کے بچّے کیونکر نہ بچ جائیں گے۔ شریف تو بیٹی دینے سے رہے۔ رذیل کی کھپت رذیل ہیں۔ یہ ہوئے موئے درزی۔ پٹے جُڑیں گے۔"

نسترن احسانات کا معاوضہ اور سلوک کا نتیجہ اپنے کانوں سے یہ سُنتی اور اُف نہ کرتی۔ فرشتہ صفت ضرور تھی کہ سنتی اور ٹال دیتی اور چُپ ہو رہتی۔ وسیم دلہن عورت تھی تو ہو، انسان تھی اور تندرست تھی۔ آنکھیں اور دماغ دونوں صحیح سوکن کا معاملہ ختم کرو۔ ضرورت تھی کہ اسلام تربیت کے اعتبار سے کرموں جلی ماں کو سبق دینا۔ دوسرا بچہ سلیم سامنے اُٹھ رہا تھا کس باپ کا بیٹا اور کس دادا کا پوتا گیارہ برس کا لوٹھا۔ وہی دو چار سُورتیں جو دادی کے طفیل یاد ہو گئی تھیں وہ البتہ طوطے کی طرح رٹوالو۔ اُس کے آگے الف کے نام بے تک نہیں جانتا تھا۔ دن بھر گلی کے آوارہ لڑکے اور گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں جانگیہ پہنے یا لنگوٹ باندھے دریا کے کنارے کبڈی کھیلتی یا لا ہو رہا ہے اندھیری رات تو دس اور چاندنی رات میں بارہ ایک بجے آیا روٹی کھائی اور پڑ رہا۔ دُنیا ہی نے بدنصیب ماں کو سمجھایا مگر مرے اُس کی ماں جو کبھی جھُوٹ موٹ بھی بچہ کو آدھی بات کہی ہو بلکہ اُلٹا کہنے والوں ہی کو ڈانٹ دیا کہ سیانا بچہ کیا مُنہ لگوں۔ بُری لگ گئی۔ نکل کھڑا ہوا کسی کا کیا جائے گا۔ میں ہاتھ جھاڑ بیٹھ جاؤں گی۔ اِس غفلت کا نتیجہ ظاہر تھا کہ جس نسیمہ نے اُن بچّوں کو جن کی سات پشت میں بھی کوئی پڑھا لکھا نہ تھا عالم اور فاضل بنا دیا اُس کا پوتا مزے سے گُھبّی پالا کھیلتا اور دھڑتے سے کبوتر اُڑاتا کبھی آم پر چڑھے کیریاں توڑ رہے ہیں۔ کبھی املی پر چڑھے کتارے کھا رہے ہیں۔ سلیم وسیم کا بچہ نہیں رانڈ کا سانڈ تھا کہ گھر میں رہتا تو اور باہر جاتا تو جدھر نکل جاتا تراہ تراہ مچ جاتی۔ اس کو مار اُس کو دھاڑ، یہاں لُوٹ وہاں کھسوٹ چاروں طرف سے شکایتیں تھیں۔ مگر صد آفریں اُس بدنصیب ماں کو یہ سب کچھ آنکھ سے دیکھتی اور کان سے سنتی مگر ٹس سے مس نہ ہوتی۔ خدا دشمن کو بھی ایسی بدبخت

ماں نصیب نہ کھیے جیسی اسلام اور سلیم کی تھی۔ یہ درست ہے کہ باپ سر پر موجود نہ تھا مگر بچوں کی تربیت کا واسطہ باپ سے برائے نام ہے۔ درحقیقت ان کی تربیت کی ذمہ داریاں ماں پر ہوتی ہیں۔ وسیم دلہن بچہ کی عاشق تھی فریفتہ تھی، شیدا تھی مگر اندھی نہ تھی۔ ہرماں ہوتی ہے۔ اُس کا اگر ایک کھو کر ایک بچہ تھا تو سوکن کے بھی گرے پڑے نہ تھے۔ گود کا بچہ ڈیڑھ پونے دو برس کا ہوگا۔ دیکھ دیکھ کر جیتی گھر میں آئی کا چین۔ بچہ نے لوکاٹ مانگے۔ فوراً منع کر دیا۔ تڑپا، لوٹا، ضد کی ایڑیاں رگڑیں۔ کوٹھری میں لے جا بند کر، منہ ڈھانک چپکے سے لیٹ گئی مگر اس کی ضد پوری نہ ہونے دی۔ بچہ کو تکلیف ضرور ہوئی اور بچہ سے زیادہ ماں کو۔ مگر یہ سبق عمر بھر کو کافی تھا۔ ایک بی وسیم دلہن ماں تھیں کہ بچہ کی گولیوں کے واسطے پر محلہ قرض لیا اور اُس کی خواہش پوری کی۔ تربیت کی اس غفلت کا نتیجہ آنکھیں شب و روز دیکھ اور کان رات دن سُن رہے تھے۔ بہو اسی واسطے "ہزار برس کی نیو" کہلاتی ہے کہ عمارت خاندان کی بنیاد اس نے اپنا فرض سمجھ لیا۔ اور بچوں کی تربیت درست کر دی تو خاندان کو چار چاند لگا دیئے اور اگر کانوں میں تیل اور آنکھوں میں پھلیاں ڈالے بیٹھی رہی، بچوں کو پیٹ بھر کر بگڑنے دیا تو بزرگوں کی آبرو اور خاندان کی عزت سب خاک میں ملا دی۔ دُلہن بننا کہنے کو مشکل نہ ہو مگر اس کی تہہ میں وہ سخت ذمہ داری مضمر ہے جس نے خاندان بنا اور بگاڑ دیئے۔

جون کے مہینے میں دوپہر کے وقت نسترن اندر کے کمرہ میں بیٹھی رومال پر غازی کا نام کاڑھ رہی تھی کہ منجھلا لڑکا رؤف پانچ برس کا۔ آتے سے کہنے لگا "کپڑے اتار دے نہاؤں گا"۔ کہنے والا بچہ تا سمجھ سننے والی گدھی کہ سنتے ہی تعمیل کو فوراً ہی تیار ہوگئی۔ کرتا اور پاجامہ دونوں اُتار دیئے۔ ٹب بھری ہوئی پانی لو میں اونٹ رہا تھا۔ بچہ جا بیٹھ گیا۔ نسترن کا یہ بچہ عجیب قسم کا بچہ تھا۔ اتنا مسکین لمنا

غریب اس قدر خاموش اور بے نفس بچہ دیکھنے میں تو کیا سننے میں بھی کم آیا ہے۔ رحم اُس کی صورت دیکھ کر اور پیار اُس کی کیفیت سُن کر آتا تھا۔ ضِد یا ہٹ درکنار دِن رات میں گنتی کی چند باتیں کر لیتا ہو۔ عید یا بقر عید ہو یا شادی بیاہ ہو اُس کو جلے کپڑے سے واسطہ تھا نہ نئی جوتی سے جو مل گیا وہ لے لیا، جو آگیا وہ پہن لیا۔ اُس کی معصومیت پر ماں اور باپ دونوں کا کلیجہ کٹتا تھا۔ نسترن لاکھ پوچھتی عارف ہزار کہتا۔ مگر وہ ایک خاموش نگاہ سے دونوں کی صورتیں تک کر نیچی گردن کر لیتا۔

ماں اور باپ دونوں کی زندگی ہیں اُس کی صورت پر یتیمی برستی تھی، ایسا مردہ دل اور خاموش طبیعت بچہ اِس عمر اور اس وقت میں خدا ہی کی قدرت تھی۔ باپ اگر بھولے بسرے گھڑک دیتا ماں جل بُھن کر مار دیتی تو دونوں گھنٹوں پچھتاتے اور افسوس کرتے۔ ایک رات پہلے کا ذکر ہے کہ لکھنؤ سے کسی دوست نے عارف کو خربوزے بھیجے تھے جب تقسیم کر کرا کے نسترن نے دو قاشوں میں قتلے گھر کے واسطے رکھے۔ ایک عارف کے واسطے ایک بچوں کے لئے۔ عارف کچہری چلا گیا۔ تو بچے بیٹھے۔ فصل کا میوہ باہر کی سوغات ٹوٹ پڑے اور دم بھر میں قاب صاف کر دی۔ مگر اس معصوم نے اپنی سالن کی طشتری سے کام رکھا۔ جب خربوزے ختم ہو گئے اور ماں نے پوچھا "ارے تو نے بھی کھائے؟" تو بڑے نے کہا "اُس نے تو ہاتھ بھی نہیں لگایا" اور وہ ماں کی صورت دیکھ کر خاموش ہو گیا، اب ماں کو جو چند قتلے شوہر کے ساتھ کھانے تھے زہر تھے۔ اس خیال کے آتے ہی کہ میں نے کھائے یہ محروم رہا اُس کے دل پر جو گذری ہو گی وہی جان سکتی ہے۔ دن بھر اُس کا مُنہ دیکھ دیکھ کر دِل ہی دِل میں کُڑھتی رہی۔ شام کو نہلایا کپڑے بدلے اور کہا "جا تو بھی تھوڑی دیر کے لئے باہر ہو آ" وہ ادھر گیا۔ آپ اس لئے کہ میاں کے آنے کا وقت تھا جھاڑو بہارو میں لگی۔ ماماتیں خدا کی عنایت سے دو دو تین تین موجود تھیں۔ مگر اس کا کام زیادہ تر

خود ہی کرتی تھی۔ چائے تیار کی انڈے تلے حقہ بھر کر آرام کرسی درست کر رہی تھی
کہ عارف بچہ کا کان پکڑے غصہ میں لال اندر آیا۔ اور دو تھپڑ اس زور سے
مارے کہ بلبلا گیا۔

نسترن "کیا ہوا ؟"

عارف "ہوا کیا خاک، بڑے گھوڑے کی کاٹھی بالکل ناس کر دی۔
چاقو قینچی سے کتری ہے ؟

نسترن "لے ہے۔ یہ تو ابھی باہر گیا ہے۔ مشکل سے پانچ سات منٹ
ہوئے ہوں گے "

عارف یہ کہہ ہی رہا تھا کہ سائیس نے دروازہ پر آکر کہا سرکار سلیم میاں
نے کتری ہے جب میں آیا ہوں میری صورت دیکھ کر بھاگے ہیں "

بچہ کے دونوں کلوں پر پانچ انگلیاں پڑی ہوئی تھیں۔ اور کان بیر
بہوٹی ہو رہا تھا۔ آنکھ سے آنسو بہ رہے تھے۔ مگر ہاں یا نہ کا جواب اب بھی
نہ تھا۔

باپ نے ہاتھ پھیر کر اپنی ندامت کا اظہار کیا۔ اور ماں نے گلے سے
لگا کر معصوم کی بے گناہی اور اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ رات آ چکی تھی بچہ پڑ کر
سو گیا۔ مگر دونوں ماں باپ دیر تک اس حالت پر افسوس کرتے رہے۔

ننگا بدن نیچے پانی اوپر لو باہر نکلا تو حرارت اور حرارت کے ساتھ ہی بخار
کپڑے پہن، رضائی اوڑھ چارپائی پر جا پڑا۔ ماں کو خبر نہ باپ کو علم، نوکروں کو
اطلاع نہ آقا کو آگاہی۔ گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ پڑا رہا۔ لیکن ظہر کے واسطے نسترن
جو باہر نکلی اور یہاں لیٹا دیکھا تو پوچھا " بیٹا اس طرح کیوں پڑا ہے " جواب نہ ملا تو
پاس آئی۔ آنکھیں دیکھیں۔ تو بند۔ پنڈا دیکھا تو آگ گھبرا گئی۔

اٹھایا اندر لائی، لٹایا، ماماؤں سے پوچھا اماں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ گھنٹہ بھر پانی میں غوطے لگائے۔ سب سے پہلے اپنی غفلت کا افسوس ہوا کہ اگر فرائض کی ذمہ داری محسوس کرتی اور تربیت میں تساہل نہ ہوتا تو یہ وقت کیوں دیکھنا پڑتا۔ مگر تنگی کے آگے تربیت کا خیال تھا نہ تغافل کا شام کو عارف آیا، رات کو ڈاکٹر اور حکیم کی تجویز ہوئی کہ لُو لگی ہے۔ دس بجے ہوں گے حکیم صاحب نے فرمایا "آم کی کیری بھُبلا کر پلا دو۔"

رات زیادہ آگئی کیری کا ملنا مشکل تھا۔ اماں نے کہا "بڑی بہو کے ہاں بہت سی رکھی ہیں" نسترن کہنے کو کیسی ہی زبرہ ہو مگر طبیعت کی اتنی شیر تھی کہ سوکن کی شرمندۂ احسان کبھی نہیں ہوئی۔ اس وقت بھی اس نے کچھ سوچا، مگر ماممتا عادت پر غالب آئی اور یہ تمام عمر میں پہلا اتفاق تھا کہ نسترن جیسی غیور عورت سوکن سے مدد کی ملتجی ہوئی۔

وسیم دُلہن اگر ایمان سے نہیں صرف انسانیت سے کام لیتی تو اُس کی گردن کیا رگ رگ نسترن کے احسان سے دبی ہوئی تھی۔ کیریاں کیسی اگر خود بھی قربان ہو جاتی تو اُس کے معاوضہ سے سبکدوش نہ ہوتی لیکن انسانیت ہوتی تو یہ نوبت ہی کیوں پہنچتی، آدھی رات کا وقت تھا جب نسترن نے آکر کہا۔

"میرا منجھلا بچہ بخار میں لوتھ پڑا ہے، لو لگی ہے حکیم صاحب نے کیریاں بتائی ہیں اس وقت بازار بند ہے آپ دو تین کیریاں دے دیجیے۔"

وسیم دُلہن "مجھے کیریاں دینے میں تو عذر نہیں، مگر بچے بچے سب برابر ہیں سلیم میاں شوق سے توڑ کر لائے ہیں، وہ اللہ رکھے اب آتے ہی ہوں گے، اُن سے پوچھ کر تو تین کیا چھ دے دوں گی۔"

اس کا جواب نسترن نے کچھ نہ دیا، اور خاموش آکر بچہ کے سرہانے بیٹھ

گئی۔ بخار لمحہ بہ لمحہ تیز ہو رہا تھا اور جسم کی یہ کیفیت تھی کہ ہاتھ دھرنا مشکل تھا، چنے بھُن رہے تھے۔ یہ وقت نسترن پر عجیب مصیبت کا تھا، بچّہ کی بیہوشی بدستور تھی وہ اگر چیختا چلّاتا تو شاید اس قدر پریشان نہ ہوتی۔ خاموشی نے دِل ہوا کر دیا۔ ہنڈا دیکھتی تھی۔ آواز دبتی تھی اور کلیجہ پر ایک گھونسہ مار ہلکے کر چُپ بیٹھ جاتی تھی۔

اِس وقت جس خیال نے کلیجہ کے ٹکڑے اڑا دیئے وہ اس کی مسکینی اور اپنی لاپروائی تھی۔ سوچتی کہ رؤف اب بچتا نہیں۔ پانچ سال کے واسطے میرا مہمان تھا، مجھ سے زیادہ بدنصیب اور کون ہوگی۔ ایک لمحہ اس پر توجہ نہ کی۔ معصوم بے گناہ پٹا اور خواہ مخواہ کُٹا، ہائے اللہ میں خربوزے کھاؤں اور یہ ترسے۔ کان سُرخ کلّے لال ہو جائیں۔ ٹر ٹر باپ کا مُنہ اور میری صورت دیکھے اور اُف نہ کرے! بس نہ چلتا تھا کہ لپٹ کر قربان ہو جاتی۔ بلائیں لیتی تھی پیار کرتی تھی، بلبلاتی تھی، اور روتی کہ بچّہ نے آنکھ کھولی۔ دیکھا تو ماں دھاروں رو رہی ہے۔ معصوم نے ہاتھ اس کی گردن میں ڈال دیئے، اور کہا "اماں جان! روؤ نہیں، دیکھو بخار اُتر گیا میں اچھا ہوں۔" ایک سنسنی سی آئی اور بدن تھر تھر کانپنے لگا۔ بچّہ پر اتنا کہہ کر غفلت طاری ہو گئی۔ رات خاموشی کے ساتھ حدودِ صبح کی طرف رواں تھی اور ایک روشن چراغ نسترن کے لال کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا۔

ماں کی خاموش آنکھیں بچّہ کے چہرہ پر تھیں۔ اور ماتا ہر ہر پہلو سے ناامیدی کا یقین دلا رہی تھی۔ کبھی عالمِ خیال میں اُس کا کفن سامنے آتا تھا۔ اور کبھی غسلِ میت کی تیاریاں گھر میں دکھائی دیتیں۔ ہائے کرتی اور گرتی۔ وائے کرتی اور اٹھتی دفعتہً ایک خاص خیال دل میں پیدا ہوا۔ دماغ چکرایا۔ اور کلیجہ منہ کو آنے لگا۔ دیواروں کو دیکھ کہنے لگی "وہ بدنصیب مسافر جس کی مہمان نوازی ایک دِن ماں نہ

کر سکی اِس وقت تم سے رخصت ہوتا ہے۔" بیٹھ گئی اور سوچنے لگی اب بچہ کی عمر گذشتہ کا ہر لمحہ آنکھ کے سامنے تھا۔ ہر واقعہ کو یاد کر کے کانپ رہی تھی۔ آپ گھر کے کام میں مصروف ہے بچے لڑ جھگڑ کے پراٹھے کباب لے رہے ہیں۔ وہ خالی طشتری لئے اس اُمید پر خاموش بیٹھا ہے کہ ان سے فارغ ہو کر مجھ کو بھی دیدیں تو کھالوں۔ عقیقہ میں سے رات کو واپس آئی سب بچے مزے سے بچھونوں پر لیٹے کہانیاں اور پہیلیاں کہہ رہے ہیں۔ اور وُہ کھرّی چارپائی تکیہ نہ بچھونا بے خبر پڑا سوتا ہے۔ پرواز خیال چھُری کی طرح ذبح کر رہی تھی کہ وہ وقت یاد آیا جب چھوٹی بچی کی پیدائش پر سخت بیمار پڑی تھی۔ حکیم ڈاکٹر بھی حیران ہو گئے، آپ پلنگ پر پڑی بخار میں بلبلا رہی ہے۔ بڑے بچے باہر تخت پر بیٹھے آموں کے حصے کر رہے ہیں۔ اور رؤف ننھے ننھے ہاتھ اُٹھا کر کہہ رہا ہے۔" اے اللہ میری اماں جان کو اچھا کر دے" نسرین کیا جانی دشمن بھی ہوتا تو بلبلا جاتا۔ اِن ہاتھوں کو اُٹھا کر کلیجہ سے لگالیا اور ساتھ ہی خیال آیا کہتا تھا اللہ اللہ کرو۔" اُٹھوں خدا سے دعا مانگوں۔

نسرین نماز کی سختی سے پابند تھی۔ یہ نماز کا وقت بھی نہ تھا، مگر اُٹھی وضو کیا جا نماز بچھانا چاہتی تھی کہ خیال آیا مجھے اس مصیبت میں خدا سے مدد کا حق حاصل ہے یا نہیں۔ میں بھی کبھی خدا کی مصیبت میں کام آئی جو وہ میرے کام آئے مگر توبہ توبہ نعوذ باللہ کیا کہہ رہی ہوں، لیکن کیوں جب یتیم اور مسکین کی صورت اُسی کی صورت ہے تو حاجتمندوں کی حاجت اور بد نصیبوں کی مصیبت بھی اسی کی مصیبت ہے۔ کیا اس سے پہلے کسی حاجتمند ماں کا بچہ اسی طرح میری آنکھ کے سامنے نہیں آیا ضرور آیا۔ بڑی بی بی کا نواسہ میعادی بخار میں ۲۱ روز ۲۱ رات میری آنکھوں کے سامنے پڑا رہا۔ میں نے بڑھیا نانی، رانڈ اور یتیم بچہ کو کیا مدد دی۔ وہ حاجتمندوں کی حاجت نہیں خدا کی، اور مریضوں کی اعانت نہیں مالک برحق کی تھی۔ ماں سامنے

والی کوٹھری میں تڑپ رہی تھی اور میں کمرے میں ہنس رہی تھی۔ نانی معصوم کو دیکھ دیکھ کر بلک رہی تھی، اور میں بچوں کے پاس بیٹھی قہقہے لگا رہی تھی۔ اس خود غرضی، اس نفسانیت اور اِس حیوانیت پر میں آج کیا حق رکھتی ہوں کہ خدا سے اعانت چاہوں فرشتے میری التجا میرے مُنہ پر پٹک دیں گے۔ یہ درخواست بے حمیتی یہ التجا بے غیرتی کس منہ سے سامنا کروں۔ کس برتے پر سامنے آؤں اور کس کل پر مدد مانگوں۔ اگر تمام عمر میں ایک دفعہ بھی خدا کا کام کرتی تو آج وہ میرا کرتا۔ میں مانگتی اچھی اور وہ دیتا بھلا لیکن اب میرا مانگنا شرم اور اُس کا دینا کرم۔

رات ختم کے قریب پہنچ چکی تھی۔ چاند مدھم اور تارے جھلملا رہے تھے۔ چراغ کی روشنی آمدِ صبح کا پیام دے رہی تھی۔ نسترن ان ہی خیالات میں غلطاں پیچاں تھی اور عارف پڑا سو رہا تھا۔ نسترن کی نظر اُس وقت بچے کے چہرہ پہ نہیں آسمان کی جانب تھی کہ رات کے سناٹے میں عارف کسمسایا اور اُس کی زبان سے نیند کی حالت میں یہ الفاظ نکلے "زبان دے اور سچی دے، بچہ بلے اور اچھا لے"

اتنا کہہ کر عارف کلمہ پڑھتا اُٹھ بیٹھا، ہر چند نسترن نے پوچھا کہ کیا کہہ رہے ہو، مگر وہ کچھ نہ بتا سکا۔ نسترن اس کو صدائے غیبی سمجھی اُسی وقت سجدے میں گری اور کہا۔

"اے مولا تندرست رؤف کو کلیجہ سے چمٹوا دے، وعدہ کرتی ہوں کہ ہر یتیم کو رؤف سمجھوں گی۔"

اُٹھی رات کی سیاہی پردۂ دنیا سے دُور ہو رہی تھی۔ پو پھٹ رہی تھی اور آسمان شب سیاہ کو وداع کہہ رہا تھا، فجر کی نماز پڑھی۔ بچے کے پاس آئی، دیکھا تو پسینہ میں شور اشور تھا، خوشی کے مارے اُچھل پڑی۔ رؤف اچھا ہو گیا۔ مگر اُس روز کے بعد کوئی یتیم بچہ نسترن کے سامنے ایسا نہ آیا جس کو دیکھتے ہی اُس نے

اپنے بچوں کی طرح کلیجہ سے نہ لگایا ہو۔

(۱۰)

" تعجب کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب میں مسلمانوں کے اُس طبقہ پر نظر ڈالتی ہوں جو تعلیم نسواں میں دن رات سرگرم ہے۔ اور جو قدامت کو بُرا بھلا کہتا نئی نئی وضع وضع کی لڑکیاں پیدا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ یہ کچھ وقت کا تقاضہ اور شاید انسان کی فطرت ہوگی۔ میں آج تمہارے سامنے تعجب کر رہی ہوں زندگی میں اسی فریق کی ہم خیال تھی۔ اگر کسی بڑی بوڑھی پر نظر پڑ جاتی تھی تو اس کی سادگی اور جہالت پر بے اختیار ہنسی آتی تھی اور دل چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی لڑکیاں پردے کو پھونک اپنی ترقی کا فکر خود ہی کریں۔ میں دن رات تعلیم یافتہ لڑکیوں کو دیکھتی تھی اور دیکھتی کیا ملتی جلتی تھی اور اُن کو دیکھ کر۔ یہ خواہش پیدا ہوتی تھی کہ کیسا مُبارک ہوگا وہ وقت جب قوم میں ہر لڑکی اِس قابلیت اور لیاقت کی ہوگی۔ مگر اب خیال کرتی ہوں تو اپنی غلطی پر ندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اور یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ تعلیم یافتہ لڑکیوں پر یہ مثل اصل کہ " دلّی والی مُنہ چکنا پیٹ خالی " ظاہر کی شوں شاں تُوم طراق یہ وہ سب کچھ تھا مگر اندر کچھ نہیں۔"

میرا یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اماں جان کی زندگی اب شروع ہوئی تو بڑھاپا تھا اور جوانی ختم ہو چکی تھی مگر وہ زندگی کہلائے جانے کی مستحق نہ تھی مجھے حیرت ہوتی تھی کہ صبح سے شام تک وہ سوئی کے ڈورے میں مصروف رہیں اور مغرب سے قبل اُنہوں نے ایک کنٹھی ایسی بے نظیر تیار کی کہ ہمارے پڑوس میں جو درزی رہتا تھا وہ دیکھ کر پھڑک گیا اور اُسی وقت دو روپے نکال کر

بھیج دیتے۔ اُس روز سے یہ معمول بندھ گیا کہ ایک کنٹھی روز وہ تیار کر دیتیں، اور درزی آنکھ بند کر کے دو روپے بھیج دیتا۔ ابتدا میں تو کچھ دقت ہوئی لیکن جب پھیر پڑ گیا اور کچھ روپے جمع ہو گئے، تو سب سے پہلے کام اماں جان نے یہ کیا کہ بنئے کی اُچاپت بند کی اور اکٹھا سودا گھر میں بھروا دیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ جس گھر کے مالک کو زمانہ کی گردش نے دو روٹیوں کے واسطے بھیک منگوائی آج اس گھر والی کے سلیقہ سے آٹھ بوریاں آٹے کی موجود تھیں۔ اماں جان ایک روپیہ روز اُٹھاتیں اور ایک بچاتی تھیں۔ اُس میں سے ایک پیسہ اللہ کے نام کا اور ایک محفوظ۔ جوان بیٹی گھر میں موجود تھی، اور اس کا سہم کچھ کم نہ تھا۔ پیاموں کا سلسلہ موجود اور آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ اب اُنہوں نے گھر کی درستی پر توجہ کی۔ اور جہاں کُتّے لوٹتے اور خاک اُڑتی تھی، وہاں ایک تین ہی مہینے میں دریاں چاندنیاں بچھوا دیں۔ ابا جان کی آنکھوں کے واسطے ڈاکٹر سو روپیہ مانگتا تھا، اور گو اماں جان نے کئی دفعہ کہا کہ اللہ جلد روپیہ کا انتظام کر دے گا مگر وہ ٹھنڈی سانس بھر کر چُپ ہو گئے، اور جواب نہیں دیا۔ ایک روز کا ذکر ہے نماز صبح سے فراغت پانے کے بعد وہ ابا جان کے پاس آئیں اور کہا۔

" ذرا اس بڑی مسہری پر لیٹ جاؤ میں نے ڈاکٹر کو بلوایا ہے۔ وہ آج انشاء اللہ آنکھیں درست کر دے گا۔"

ابا جان " نہیں سو روپے بہت ہیں "۔

اماں جان "اب میں انتظام کر چکی، روپیہ ہاتھ کا میل کہاں آنکھوں سے زیادہ ہے۔ قربان کر دوں، تم ایسا خیال کیوں کرتے ہو۔"

" ابا جان " میں تمہارے احسانات کا کہاں تک شکریہ ادا کروں۔ تم نے

مجھے بتادیا کہ بیوی عورت نہیں جنت کی نعمتوں سے ایک نعمت ہے۔ مذہب یہ کہتا ہے کہ اگر خدا کے سوا کسی کو سجدے کا حکم ہوتا تو بیوی شوہر کو کرتی۔ مگر میں کہتا ہوں کہ اگر گناہ نہ ہوتا تو میں تمہاری پرستش کرتا۔"

اماں جان سنتے ہی اباجان کے قدموں میں گر پڑیں اور کہا "کیا کہہ رہے ہو۔ للہ مجھے گناہ گار نہ کرو۔

وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ ڈاکٹر آ گیا۔ وہ خود اباجان کو پکڑ کر مسہری پر لے گئیں اور ڈاکٹر نے آنکھیں بنا دیں۔ ۴۰ روز تک اماں جان نے جو خدمت کی ہے میں تو یہ کہتی ہوں کہ میں نے اس کی مثال دُنیا میں نہیں دیکھی۔

ڈاکٹر نے کہا "طبیعت پر غصہ نہ آنے پائے"۔ اُنہوں نے تیوری پر بل نہ آنے دیا۔ کیا کوئی ماما یا لونڈی کرے گی جو اُنہوں نے کر دکھایا۔ اور لطف یہ کہ گھر کے کام کاج اور اپنی سِلائی میں رتی بھر فرق نہ آنے دیا۔ اباجان کی آنکھیں چالیس دِن میں تارا ہو گئیں۔ اور ایک وہ زمانہ تھا کہ کبھی سچی محبت یا کرم کی جھلک تک نہ دیکھی۔ یا اب ہر نگاہ محبت اور احسانات سے لبریز ہوتی تھی۔ اباجان کا اعتراف تو صاف تھا لیکن اماں جان کی حالت میں یہ دیکھنی تھی کہ اِس خدمت اور ریاضت پر بھی ہمیشہ یہی سمجھتی تھیں کہ کچھ نہیں کر سکتی اور بیوی کے جو فرائض ہیں اُن کی ادائگی میں وہ قاصر ہیں۔ یہ اُن کی کسرِ نفسی نہیں بلکہ یقین تھا اور اِس وجہ سے وہ اکثر روتیں اور اباجان سے اپنے پچھلے قصوروں کی معافی مانگتیں۔

نہ معلوم آپ کو میری رائے سے اتفاق ہو یا نہ ہو، میرا تجربہ تو یہ ہے کہ دُنیا میں مفلسی کی تکلیف اُسی گھر میں زیادہ ہوتی ہے جہاں میاں بیوی میں موافقت نہ ہو۔ اِس موافقت پر مفلسی ہو یا فقیری سب قربان۔ اِس نعمت کے آگے زحمت رحمت اور اِس جنت کے سامنے ہر اذیت راحت اور ہر کلفت عشرت۔ شریف۔

میاں کی اعانت قدرت جی کھول کر اور فرشتے ہاتھ بڑھا کر کرتے ہیں۔ زمین اُن کے قدموں کو مرحبا کہتی ہوئی سر آنکھوں پر رکھتی ہے۔ اور آسمان ان ہستیوں کو مبارکباد دیتا ہوا برکت نازل کرتا ہے۔ دیکھا یا سُنا تو نہیں مگر پڑھا ہے کہ پردہ دُنیا پر کسی زمانہ میں مسلمانوں کی ایک ایسی جماعت بھی آباد تھی کہ دوسروں کی تکلیف وراحت کو اپنی تکلیف وراحت سمجھتے تھے۔ آنکھ اور کان کا تجربہ تو اس کے سراسر خلاف ہے۔ ہوں گے مگر ہم نے تو یہ دیکھا کہ ادھر تو خدا کی برکت میاں بیوی کی محبت میں ہمارے گھر پر نازل ہوئی، اُدھر لوگوں کے کان کھڑے ہوئے استقلال عجیب چیز ہے یہ انسانی زندگی کا بیش بہا جوہر ہے۔ اگر اماں جان کا جی چھوٹ جاتا تو ہمارے نقیر ہونے میں کسر ہی کیا رہ گئی تھی۔ ہم بھیک مانگتے بڑوں کی آبرو خاک میں ملتی۔ آیندہ نسلیں نامُراد ہوتیں۔ اُنہوں نے ناکامی میں کامیابی کا راز دیکھا اور نفرت میں محبت کی جھلک دیکھی، لونڈی بن کما یا، اور بیوی بن کھایا۔ وہی ہمارا گھر جس میں خدا کا نام بھُولے سے بھی کوئی نہ لیتا تھا۔ اب ایسا تھا بچہ بچہ نماز پڑھتا، عبادت کرتا! کمائی تھی اور سلیقہ تھا تو صرف اماں جان اور فقط اماں جان کا۔

چند ہی روز میں ہمارے گھر کی حالت کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔ اب عزیزوں میں چپے ہوئے کوئی کہتا تھا دولت نکلی۔ کسی کا خیال تھا جوا جیتے۔ مگر عقلمند اتنا نہ سمجھ سکے کہ بیوی، فقیر میاں کو بادشاہ بنانے کی طاقت رکھتی ہے۔ عورت کا صبر واستقلال ایک لازوال دولت اور قدرت کا وہ نُور ہے جو زمین سے نہیں، اس کے دل سے نکلتا ہے اور گھر کے در و دیوار کو منوّر کر دیتا ہے۔

بقرعید کی ساتویں تاریخ تھی اماں جان نے گھر میں سپیدی اور تمام برتن قلعی کروا دیئے۔ آٹھویں کو مکان کے چپہ چپہ میں بچھونا ہوا۔ دن کو مہمان آنے

شروع ہوئے، کُنبہ بھی اور محلّہ بھی۔ پھوپی بھی اور پھوپا بھی، گھر آدمیوں سے پٹا پڑا تھا۔ جب صُبح صادق نے رات کو وداع کیا اور روز روشن کے آنے کی تیاریاں ہوئیں تو ابا جان نماز فجر جماعت سے پڑھنے کے بعد گھر میں آئے انہوں نے اماں جان کا ہاتھ پکڑا اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کر کہا۔

"یہ وہ روز اور وہ وقت ہے کہ تیری بے شمار مخلوق تیرے اُس گھر میں حاضر ہوئی جس کی بُنیاد اُن مبارک ہاتھوں سے پڑی جن کے واسطے آگ کے وہ شعلے جو آسمان سے باتیں کر رہے تھے گلزار ہوئے۔ یہ وہ دن اور ساعت ہے۔ جب تیرے ہزاروں لاکھوں بندے ایک جگہ جمع ہو کر اس واقعہ کو تازہ کر رہے ہیں جب تیرے ایک نبیؑ برحق نے اپنے کلیجے کا ٹکڑا نذر چڑھا کر دنیا کو دکھایا کہ کس طرح نیک بندے اولاد اور مال تجھ پر قربان کر دیتے ہیں۔ یہ وہ گھڑی اور وہ لمحہ ہے جب تیری لازوال طاقت کے روبرو سر جھکانے والے انسان اُس پیام کی تعمیل میں جو اُس مبارک زبان سے ہم تک پہنچا۔ جو متواتر فاقوں اور پے در پے اذیتوں میں تیری یاد سے علیحدہ نہ ہوئی اپنے قصور پر نادم ہو کر تجھ سے معافی کی طلبگار ہیں۔ اِس وقت ایک گنہگار انسان، ایک ناکارہ مسلمان اِس لئے کہ اُس کے اعضا اِس قابل نہیں، اِس واسطے کہ اُس کی حالت اِس لائق نہیں کہ کعبۂ خلیل میں حاضر ہو کر عرض کرتا اِس سرزمین پر اِس جماعت کے روبرو تجھ سے ملتجی ہے کہ عورت جو بیوی کی حیثیت میں اس وقت میرے ساتھ تیرے دربار میں حاضر ہوئی جس نے ایک عالم کو دکھا دیا کہ کس طرح ایک مسلمان بیوی اپنے فرائض ادا کرتی ہے۔ جس نے ایک دُنیا کو بتا دیا کہ کس طرح سلیقہ شعار عورت فقیر کے گھر کو بادشاہ کا محل بنا سکتی ہے۔ طفیل ابراہیمؑ کا جو خلیل تھا۔ واسطہ اسمٰعیلؑ کا جو ذبیح تھا اور تصدق اُس احمدؐ کا جو محبوب تھا

اس کے گذشتہ گناہ معاف کر اس التجا کو خانہ کعبہ کی قبولیت اس زمین کو بیت اللہ کا درجہ اس سائل کو مستجاب الدعوات کا درجہ عطا فرما۔

گئی ہوئی عزت، پھوٹی ہوئی آنکھیں اس کی بدولت میسر آئیں عطا کرنے والا تو لینے والا میں، دینے والا تو، دلوانے والی یہ۔ تو نے بغیر آنکھوں کے وہ منظر دیکھا جب گرمی کی چلچلاتی دھوپ میں لبیریاں لگائے اور چیتھڑے پہنے اندھے شوہر کا پیٹ بھرنے کیلئے اس نے کنٹھیاں سیں اور تیوری پر بل نہ آیا۔ تو نے بغیر کانوں کے وہ الفاظ سُنے جب مجھ بے کس و بے بس اپاہج اور لاچار شوہر کے قدموں پر سر رکھ کر اس نے گڑگڑا کر کہا "جب بیوی تھی اب لونڈی، جب بیگم تھی اب کنیز۔"

"میرا ٹوٹا ہوا دل جوڑنے اور میری چھوٹی ہمت بندھانے والی ہتی یہ عورت اور یہ بیوی، میری اندھی آنکھیں روشن میرا اجڑا ہو دل گلشن کر دینے والی یہ حُور، یہ فرشتہ اور یہ بیوی! اس نے اس تاراج دل کو جو تیرا گھر تھا، از سرِ نو آباد کیا۔ اور اِس نے کعبۃ اللہ کی بنیاد رکھی حجِ اکبر کیا۔ یہ اب تیرے رحم کی مستحق اور کرم کی خواستگار ہے۔ اِس کی دعا قبول، اس کی اِلتجا منظور، فردوس اِس کا در، جنت اس کا گھر، اس کی قبر گلزار، اس کا بیڑا پار۔"

یہ مجھے یہاں آکر معلوم ہوا کہ ابا جان کی دُعا نے چونکہ شوہر تھے منہ سے نکلتے ہی درجۂ قبولیت حاصل کیا۔ اور اماں جان کو حج کا ثواب عطا ہوا، لیکن وہاں میں نے یہ دیکھا کہ اماں جان کی زندگی سب بیویوں کے لئے ایک سبق تھی جس وقت ابا جان نے دُعا ختم کی اور بآوازِ بلند کہا کہ "بیویاں دیکھیں کہ اس طرح عورت احکامِ اسلام کی تعمیل کر کے دنیا کو باغ اور زندگی کو پھول بنا دیتی ہے۔ میرا دِل شاہد ہے اور میرا مذہب ثبوت کہ خُدا اُس سے راضی، رسُول اُس

سے خوش، اُس وقت ہر عورت جو وہاں موجود تھی تعجب سے دیکھ رہی تھی اور حیرت سے سُن رہی تھی۔ بیویوں نے عہد کیا لڑکیوں نے قسمیں کھائیں، کہ وہ اسی طرح سے شوہروں کی اطاعت سے خدا کی مقدس مرضی حاصل کریں گی، اور دین و دُنیا دونوں میں خوش رہیں گی۔

اِس واقعہ کا چوتھا روز تھا کہ میرا نکاح ٹھیرا۔ دونوں میاں بیوی اماں جان اور ابا جان اس خیال سے نہال نہال تھے کہ ایک بڑے قرض سے سبکدوش ہوتے ہیں لیکن ابا جان کے ابتدائی خیالات جو میرے دل پر جم چکے تھے ہر وقت میرے گلے کا ہار تھے۔ صحبت بھی روشن خیال لڑکیوں کی تھی اور مطالعہ میں بھی آزادیٔ نسواں اور حقوق نسواں کی کتابیں اور اخبارات تھے۔ تعجب تھا کہ آخر یہ معمہ ہے کیا۔ نکاح میرا، واسطہ میرا، شادی میری، اور کر رہے ہیں، اماں باوا مجھ سے صلاح نہ مشورہ، ذکر نہ مذکور۔ خیر یہ بحث آپ کے سوال سے متعلق نہیں، جانے دیجیئے۔ میری شادی ہو گئی اور ایک ہزار نقد بجائے کاٹ کباڑ اور برتن بھانڈے کے ابا جان نے میرے نام جمع کر رسید حوالے کی اور رخصت کیا۔ میرا شوہر ایک ناتجربہ کار لڑکا اور غریب طالب علم تھا۔ اُس کو صرف پانچ روپیہ ماہوار والدین دیتے تھے۔ اُن کی پہلی غلطی تو یہ تھی کہ تعلیم ختم کئے بغیر نکاح کیا اور دوسری یہ کہ اِس آمدنی پر جو خود اس ہی کی ذات کو ناکافی تھی میرا بار بھی ڈال دیا۔ نئی نئی شادی وہ دولہا، میں دُولہن۔ وہ اور میں دونوں دل مار کر بیٹھ گئے مگر اس کے بعد میری سمجھ میں اِس کی یہ تدبیر آ گئی کہ نقد روپیہ آخر کس کام کا ہے۔ ہم زندہ ہیں تو سینکڑوں کمائیں گے اور اُٹھائیں گے۔ اور جب ہم ہی دُکھ سہیں اور تکلیف بھگت چل بسے وہ ہزار کس کام کے۔ میرا شوہر حمبیل افسوس یہ کہ بالکل چھچھورا لڑکا تھا۔ اُس کی باتیں، ترکیبیں مشورے

صلاحیں، کھلی ہوئی خود غرضی اور چالاکی و عیاری تھیں۔ مگر افسوس میں باوجود اماں جان کی فہمائش اور باوا جان کے سمجھانے کے خاک نہ سمجھی۔ اُس نے ایک ہی دو مہینے میں زیور پیچ باپچ الگ کیا۔ لاکھ اماں ابا نے منع کیا مگر میری آنکھوں پر کچھ ایسے پردے پڑے کہ کچھ نہ سجھائی دیا۔ یہ مرحلہ معمولی نہیں بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ اسلام کا حکم عورت کے واسطے صاف ہے۔ لیکن ظلم ہوگا اگر میں کہوں کہ مری وہ حالت خدا اور اُس کے رسول کے احکام کی تعمیل تھی، ایمان کی تو یہ ہے کہ ابا جان کے ابتدائی خیالات کا اثر مجھ پر نہ ہوتا اور میں آزاد منش عورت نہ ہوتی تو ہرگز اس کے پھندے میں نہ پھنستی۔ خدا اور رسول کے احکام کا یہ منشا نہ تھا کہ میں ماں باپ سے فرنٹ ہو جاؤں۔ ظالم نے دشمن کر دیا۔ اُن غریبوں کی دی ہوئی چیز میں انکار کی وجہ، روکنے کا سبب، روپیہ دیدیا، اور چار مہینہ وہ گلچھڑے اڑائے کہ واہ واہ، دن عید، رات شب برات تھی۔ ہزار روپیہ ہزار اشرفیاں تھیلیں بھرے ہو گئے۔ روپیہ نہ رہا۔ مگر اس سلسلہ میں جو باتیں پیش آئیں وہ باقی رہ گئیں۔ اِس تمام معاملہ کے ذمّہ دار میرے ساس سُسرے ہیں جنھوں نے اپنے بیٹے کا گھر آباد کرنے کے واسطے تین زندہ رُوحیں خاک میں ملا دیں وہ اپنے لڑکے کے حالات و عادات سے اچھی طرح واقف تھے۔ وہ اپنی مالیت اور لڑکے کی طبیعت کو خوب سمجھتے تھے۔ انھوں نے مکر کیا فریب کیا دھوکا دیا۔ ایک کی شادی دوسرے کی بربادی کی۔ اِس قسم کی شادیوں میں ماں باپ، بیٹے اور بہو دونوں کے سر پر انکس ہوتے ہیں۔ یہاں یہ بھی نہ تھا۔ وہ میرے ہی کیا اپنے اماں باپ کو جوتی پر مارتا تھا، اماں باوا میری صورت کو ترستے، میری آواز کو پھڑکتے مگر مجھے اُن کے ہاں جانا اور بات کرنا قسم تھا اُن کی مامتا نے کئی دفعہ مجھے بلایا میری نالائقی تھی کہ ایک دفعہ نہ گئی، شوہر اُنیس برس کا ٹلو اعقل یا تمیز رکھتا ہی کیا خاک

تھا۔ ابا جان کی ابتدائی شفقت کا نمونہ برقع اور پردہ سب کو آگ لگائی دن بھر مزے سے سیریں کرتی اور رات بھر اطمینان سے تماشوں میں رہتی۔ یہ خبریں ابا جان کے کانوں تک پہونچیں اور شہر بھر کی انگلیاں اُن کی طرف اُٹھنے لگیں۔ عزت دار آدمی بڑھاپے کا زمانہ گھر میں جاتے اور بچوں کی طرح ڈھاڑیں مار کر روتے اور کہتے۔

"ہائے میری ناک کٹ گئی کمبخت نے باپ دادا کی عزت خاک میں ملادی"۔

یہی نہیں کہ میری ہی خبریں ان تک جائیں بلکہ اُن کی بچی میرے پاس آتیں۔ وہ روتے میں ہنستی۔ وہ چیخیں مارتے میں قہقہے لگاتی۔

ایک دن کا ذکر ہے۔ میں شام کے وقت خاموش بیٹھی تھی گینتی آئی جو میرے ہاں اکثر آیا کرتی تھی۔ ایک پردہ مسہری کا لے کر آئی اور کہا "آپ لیجیے پردہ کیا ایک جادو تھا کہ میں دیکھتے ہی پھڑک گئی۔ اور جب اُس سے قیمت پوچھی اور اُس نے سَو روپیہ کے مال کے دس کہے تو ایک کہی نہ دو چُپکے سے روپیہ نکال حوالے کئے اور پردہ مسہری پر ڈال باغ باغ ہو گئی پردہ چوری کا تھا میری خوشی ابھی ختم نہ ہوئی تھی کہ گھر کی تلاشی شروع ہوئی۔ اور پولس وہ پردہ لے مجھ کو ڈولی میں بٹھا شوہر صاحب کے ساتھ ساتھ تھانہ پہونچی۔

"مجھے خسر صاحب کی ہمدردی کا حال تو ہٹتے ہی معلوم ہو گیا جب انہوں نے کہا ہمارا کیا ہے بیٹی تو ہے نہیں بہو ہے۔ رکھی تو ساس سسروں کی اور کاٹی تو اماں باوا کی" رہا شوہر اُس کا یہ حال تھا کہ میری وجہ سے نہیں" اپنی تکلیف کی وجہ سے گھر میں اور سڑک پر تھانہ میں اور کوتوالی میں برابر ہزاروں نفرینیاں کر رہا تھا۔ کچھ میرے خسر صاحب کی کوشش رات کے دس بجے ہوں گے کہ پولس نے شوہر کو صبح حاضر ہونے کے وعدہ پر رہا کر دیا۔ اور مجھ کو ڈولی

سے باہر نکال کر حوالات جانے کا حکم دیا۔ دیکھئے اس وقت بھی اِس بیان سے میرے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اُتری، کہار ڈولی لے چلتے ہوئے۔ برقع میرے سر پہ نہ تھا۔ دوپٹہ اوڑھے تھر تھر کانپ رہی تھی اور چاند کی روشن آنکھیں میرا تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ میں نے سامنے سے ایک بڈھے کو آتے دیکھا اُس کی کمر جھکی ہوئی تھی۔ لکڑی ٹیکتا آیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ اُس کے چہرے پر نقاب تھی، ہاتھ پاؤں لرز رہے تھے، اور مُنہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ تھانہ دار نے میری طرف دیکھ کر سختی سے کہا "لے جاؤ حوالات میں" اور اُس سے گھُرک کر پوچھا "کون ہے تو" میں نے دیکھا کہ اب اُس کے بدن میں رعشہ تھا۔ وہ آگے بڑھا اور کانپتے ہوئے ہاتھوں سے ایک پرچہ تھانہ دار کو دیا۔ چاند پورا تھا۔ تھانہ دار نے ہنس کر آواز سے پڑھا:

"شرافت کسی خاندان یا ذات کا نام نہیں، ذِلت اور عزت انسان کے اپنے اعمال ہیں، میرا یہ کہنا کہ بدنصیب عورت جو اس وقت حراست میں ہے شریف ہے یقیناً فریب ہوگا۔ مگر یہ کہنا بلاشک صحیح کہ یہ اُس دادا کی پوتی ہے جس نے دس برس کی لڑکی کو دہلیز لانگنے پر زندہ دفن کر دیا اور اُس ماں کی بیٹی جس کا آنچل اِس وقت تک غیر مرد نے نہ دیکھا دفن کا سلوک ہے جو آج اس کو قیدی بنا کر اِس سرزمین پر گھسیٹ لایا۔ میں اس کے بدنصیب دادا کا جس کی روح اِس وقت غیرت سے لرز رہی ہو گی نمک حلال غلام ہوں۔ تھانہ دار صاحب اس سے زیادہ نازک وقت آپ کی آنکھیں مشکل سے دیکھیں گی کہ آزادی اور خبط اور عقل کے پھیر اس عورت کو جس کے بزرگوں کے کُنبے ابھی قبرستان میں زندہ ہیں پردہ سے نکال کر حوالات میں لے آئے۔ یہ رحم کا وقت اور عنایت

کی گھڑی ہے اور اُس سید کی روح جس نے جان دی اور نواب سراج الدولہ کو بیٹی نہ دی. میری ہیئت میں آپ سے ہاتھ جوڑ کر اعانت کی ملتجی ہے یہ عادی چور اور جرائم پیشہ اقوام سے نہیں. اِس کا بڈھا بدنصیب باپ اور ماں دیواروں سے سر پھوڑ رہے ہیں. اگر آپ اس وقت رحم سے کام لیں گے تو میں اس کے سوا اور کیا کہوں کہ خدا آپ پر رحم کرے گا.

تھانہ دار نے اس پرچہ کو پڑھ کر اُس شخص کو اپنے پاس بُلا لیا اور آہستہ آہستہ کچھ باتیں کرنے لگا. بعد میں مجھ سے کہا: "جا اِس شخص کے ساتھ چلی جا."

میں باہر آئی ڈولی نہ تھی. مگر میرا شوہر باہر موجود تھا. اور سامنے ماں کی ماری ماں برقعہ اوڑھے کھڑی تھی. مجھے دیکھ کر کچھ تو اس لئے کہ میں اتنے عرصہ کی چھوٹی ہوئی تھی مگر مجھ پر سوا اس کے جو سرمدتوں اُن کے سینہ اور کلیجہ سے چمٹ رہا اُس وقت بھی لپٹا ہوا تھا اور کوئی اثر نہ تھا. انہوں نے اسی حالت میں مجھ سے کہا: "چل بدنصیب گھر چل." اس کے ساتھ ہی شوہر نے کہا: "میری عزّت خاک میں ملی، میری آبرو برباد ہوئی، تمہارے ساتھ چلنا کیسا میں لے جاؤں گا."

امّاں جان: "میاں بے شک تمہاری آبرو برباد ہوئی اس کا علاج کیا کیا جائے گا کہ آیندہ ایسا نہ ہو. تم کو کون منع کرتا ہے."

شوہر: "معاف کیجئے. خدا مجھ کو آپ کی دہلیز پر نہ لے جائے. آپ نے روپیہ ہضم کرنے میں کیا کسر رکھی تھی. جیسی مائی ویسی جائی."

اتنا کہہ کر شوہر نے امّاں جان کو جھٹک کر میرا ہاتھ پکڑا. اب وہ شخص آگے بڑھ کر میرے قدموں پر گر پڑا اور کہا: "خدا کے واسطے رحم کر." ہائے کس طرح کہوں وہ میرا بدنصیب باپ تھا. جس کا سر میں نے قریب قریب اُسی طرح کراہیت سے ٹھکرا کر اپنے پاؤں ہٹا لئے. اُنہوں نے نہایت حسرت سے کہا: "مجھ کم بخت

باپ کی اس سفید داڑھی پر رحم کر تو اُس ماں کی بیٹی ہے جس کا ثانی اس روئے زمین پر نہیں " مگر افسوس میرے کان پر جُوں نہ چلی اور شوہر کے ساتھ آگے بڑھی صُبح کے وقت اُس مکار نے مال و متاع چھین چھان مجھ کو گھر سے باہر نکال دیا اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ میں میکہ آئی۔ گھر میں قدم رکھتے ہی جو سماں میری آنکھوں نے دیکھا وہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ ابا جان کا سر اماں جان کی گود میں تھا اماں جان کی آنکھ سے آنسو جاری تھے اور ابا جان کی آنکھیں بند تھیں، وہ اُن کا آخری وقت تھا۔ رات کے صدمے اور میری بے وفائی نے جان لے کر اُن کا پیچھا چھوڑا میں گھر میں پہنچی تو اماں جان نے گھبرا کر کہا " لو دیکھو بیٹی آگئی " اُنھوں نے آنکھ کھولی۔ حسرت سے آنسو کویوں میں آئے۔ باچھیں کھلیں۔ مگر یہ خوشی آگ پر تیل تھا۔ اُن کی آنکھیں میرے چہرے پر رہیں اور روح پرواز کر گئی۔

اس گناہ کی سزا میرے واسطے دوزخ ہے مگر میرا یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ اگر مسلمانوں کی قوم اپنے سچے مذہب سے اس قدر بیگانہ نہ ہوتی تو مجھے یہ دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ ابا جان کے ابتدائی خیالات کا اثر مجھ پر پڑتا تو میں کیوں آزادی کی شیدا ہوتی۔ میرے ساس سسرے اگر بیٹے کی شادی کے وقت اپنے فرائض کو محسوس کرتے اور سمجھتے کہ پرائی لڑکی کا لانا ماں کا دودھ نہیں ٹیڑھی کھیر ہے تو میرا یہ حشر نہ ہوتا۔

یہ تو میری داستان ہے اب آپ کو میں وہ واقعہ سناؤں جس نے مجھ کو اس اذیت میں راحت پہنچائی۔ میری اُستانی مس صاحبہ نے ایک روز فرمایا کہ، " ہم کسی مذہب کو بُرا کہنا جائز نہیں سمجھتے۔ جو جس مذہب میں ہے اُس کے واسطے وہی اچھا ہے۔ لیکن اسلام نے ایک مرد کو چار نکاح کی اجازت دے کر جو سلوک

عورت کے ساتھ کیا وہ بہت ہی تعجب خیز ہے مس صاحبہ کا یہ ارشاد میرے دل پر
لکیر ہوگیا۔ اور میں سمجھی کہ یقیناً اسلام نے زیادتی کی اور عورت پر اس سے زیادہ ظلم
نہیں ہوسکتا۔ یقین نے مجھ کو ایسا برانگیختہ کیا کہ میری نیت اسلام سے ڈانواں
ڈول ہوگئی۔ واقعات کچھ ایسے پیش آئے کہ یہ یقین روز بروز پختہ ہوتا گیا۔
اور دل عیسائیت کی طرف مائل ہوا۔

ایک دن جاڑوں کے موسم میں رات کے وقت سونے کے واسطے لیٹی مگر
نیند کسی طرح نہ آئی اِدھر اُدھر کی کتابیں دیکھنی شروع کیں۔ ایک کتاب پیغمبر
اسلام صلعم کے حالات میں تھی۔ اِس کتاب کے پڑھنے سے سب سے پہلا خیال
جو میرے دل میں پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ ہم عورتیں کثرتِ ازدواج کو ظلم سمجھ رہی
ہیں لیکن جن پر خود گذری اُنھوں نے اس ظلم کو خوشی سے کیوں برداشت کیا!
اُمہات المومنین یعنی رسو اللہ کی بیویاں اچھی طرح واقف تھیں کہ سوکنیں موجود
ہیں۔ پھر نکاح پر کیوں رضامند ہوئیں۔ اور پھر یہ دیکھنے کی بات ہے کہ عائشہ صدیقہؓ
کے سوا کنواری نہیں، مجبور و معذور نہیں، اُنھوں نے جو سوکنوں پر جانا پسند کیا تو
آخر کوئی تو وجہ تھی، اور وہ وجہ اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ وہ خدا کے سچے رسول تھے
اور ہم میں سے جب کوئی شادی کا قصد کرتا ہے تو فقیر بھی اچھا بھرا پُرا گھر دیکھتا
ہے۔ وہاں فاقوں کے سوا اور کیا تھا، اور پھر چھپے ڈھکے نہیں چاند کی طرح روشن
مزا یہ ہے کہ فاقہ کی شکایت کرتی ہیں تو رسول اللہ ناخوش ہوتے ہیں۔ کیا اس کا علم
کسی کو نہ تھا۔ سب کو تھا اور اتنا تھا اور ایسا تھا کہ آج ہم تک کو ہے۔ پھر جو سوکنوں
پر اُن بیویوں نے اور اُن کے وارثوں نے نکاح منظور کئے تو نبوّت کے برحق
ہونے کے سوا اور کیا سبب ہوسکتا ہے۔ اور لیجئے عورتیں بھی معمولی نہیں چوٹی
کے خاندان اور شہر کی ناک۔ آخر وہ انسان نہیں تو کیا حُور اور فرشتہ تھیں،

خود رسول اللہ بھی ہماری طرح بشر تھے تو بیویوں میں وہ جذبہ کیوں نہ ہوتا ضرور تھا۔ مگر رسول اللہ صلعم کے نکاح کی عزت اس جذبہ پر غالب تھی، یہی وجہ صداقت رسالت کی کافی و اکمل ہے۔

اس وقت اسلام کی عظمت میرے دل میں بیٹھنی شروع ہوئی جوں جوں آگے بڑھی کتاب کا ہر ورق اور پاک زندگی کا ہر واقعہ ایسا تھا کہ بدن کے رونگٹے کھڑے ہوتے تھے۔ ان تکالیف و مصائب کی برداشت جو اس ذات پاک پر پڑیں انسان کے اختیار سے قطعاً باہر تھیں۔ میں لرز گئی۔ جب میں نے پڑھا کہ ان کانٹوں سے جو دشمنوں نے راستہ میں بچھا دیئے ہیں اُن پتھروں سے جو ظالم برسا رہے ہیں۔ چہرۂ اقدس اور پائے مبارک لہو لہان ہیں ایک متفقہ جماعت کہتی ہے کہ اگر شادی کو کہو تو خوبصورت سے خوبصورت شریف سے شریف، امیر سے امیر عورت حاضر کریں، دولت کو کہو تو سونا چاندی دام درم جس قدر کہو اور جس طرح کہو ابھی پیش کریں۔ اسلام کا نام نہ لو۔ لیکن خدائے واحد کے سچے رسول صلعم کی پاک طبیعت اس لالچ کو ٹھکرا دیتی ہے اور سنگ دل خانۂ کعبہ میں اپنی چادروں سے گلا گھونٹتے ہیں۔ آسمان و زمین دونوں دیکھتے ہیں کہ آمنہ کے لال کی آنکھیں نکل پڑیں اور قریب ہے کہ روح جسم مبارک سے علیحدہ ہو جائے کہ ایک انسان صدیق رضہ آگے بڑھ کر ظالموں کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے۔ اور کہتا ہے "ایک بے گناہ مظلوم کو صرف اس لئے مارے ڈالتے ہو کہ وہ راہ راست پر بلاتا ہے" ایک کیا ایسے ایسے اور اس سے بڑھ کر مظالم دن رات ٹوٹے مگر صداقت کے سامنے ہیچ تھے۔ دولت کی ترغیب حکومت کا لالچ شادی کا وعدہ ایک طرف اور تکالیف و مصائب کا۔ پہاڑ دوسری طرف دنیا اس سے پہلے بھی چلتی رہی اور چل رہی ہے لاکھوں کروڑوں مائی کے لال پیدا اور ناپید ہوئے

رشی بھی اور مُنی بھی، جواری بھی اور راہب بھی۔ نبی بھی اور پیغمبر بھی، مگر آغوشِ زمین میں یتیم عبداللہ جیسا بچہ کھیلا ہو تو تاریخ بنادے؟ تعلقات دنیا کو چھوڑ کر پہاڑ کے دامن میں بیٹھ کر کنارہ دریا پہ رہ کر اللہ اللہ کرنا اور بات ہے۔ بیوی بچوں کے ساتھ دُکھ میں اور مصیبت میں فاقے میں اور فقر میں عبدیت کی کسوٹی پر پُورا اُترنا اور چیز ہے۔ دو یہودی عالم توریت کے ماہر انجیل کے واقف اس پیشین گوئی کے منتظر جو خدا کی مقدس کتابوں نے دی یہ سُن کر کہ خاکِ عرب سے اُٹھنے والا رسول ظہور کر چکا۔ شوق کی آنکھوں سے دیوانہ وار لپکے اور مکہ پہنچے لوگوں سے دوکان داروں سے دریافت کیا۔ چاروں طرف ڈھونڈتے پھر رہے تھے کہ سامنے سے آدمیوں کا غول آتا دکھائی دیا۔ چاروں طرف لوگ بیچ میں ایک سیاہ کملی والا! مارتے پیٹتے چلے آرہے ہیں۔ چہرہ لہو لہان ہے۔ پیشانی سے خون بہہ رہا ہے قدرت اگر طاقت رکھتی ہے، خدا میں اگر واقعی کوئی قوت ہے تو اس سے زیادہ جلال کا کون سا وقت ہوگا۔ کہ اُس کا سچا رسول اس طرح ذبح ہو رہا ہے۔ ایک دوکاندار دونوں سے یہ کہتا ہے "محمدؐ یہ ہے"۔ دونوں آگے بڑھتے ہیں۔ اور دیکھتے ہیں کہ اس حالت میں بھی رسول ہاشمی نے چہرۂ اقدس کا خون ہاتھوں سے پونچھا۔ آسمان کی طرف دیکھا اور اس ڈر سے کہ کہیں خدا کا غضب اِن لوگوں پر نازل نہ ہو جائے گڑگڑا کر کہا۔

"الٰہی میری قوم کو معاف کیجیو اس نے مجھے پہچانا نہیں"۔

اِن واقعات کا مجھ پر کچھ ایسا اثر ہوا کہ آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اور دل نے بے ساختہ صدا دی کہ اسلام دین برحق ہے۔ میرے دل پر کچھ ایسی چوٹ لگی کہ میں دیر تک روتی رہی۔ کتاب رکھ دی۔ سچے دل سے درود شریف پڑھا اُس روز سے یہ معمول رکھا کہ روزمرہ رات کو سوتے وقت درود شریف

کا ورد کرتی اور اسی میں سو جاتی۔ یہ اُس کا طفیل ہے کہ عذاب میں بھی ثواب میسر ہے۔ اور اذیت میں راحت مل جاتی ہے۔ ہاں یہ عقیدہ یہاں آکر کھل گیا کہ جب تک عورت دُنیوی فرائض نہ ادا کرے محض دین ذریعہ نجات نہیں ہو سکتا؛

(۱۱)

نشترن کے بچّے کی صحت حیرت، تعجب، اچنبا سب کچھ ہی تھا کہ ماں اور باپ ہی نہیں حکیم اور ڈاکٹر تک مایوس ہو چکے تھے۔ کچھ خدا ہی کا فضل تھا کہ بچہ موت کے منہ سے بچا ورنہ اُمیدیں تو سب ہی ٹوٹ چکی تھیں۔ عارف اور نشترن اس صحت پر جس قدر نہال نہال ہوتے بجا تھا۔ ماں کی ممتا باپ کی محبّت مگر صحت سے بدرجہا تعجب انگیز امر یہ تھا کہ معصوم کی صحت پر سارا محلہ باغ باغ تھا اور یہ صرف نشترن کے تعلقات تھے کہ بڈھا اور جوان ہر متنفس اس کا شرمندۂ احسان تھا۔ بیمار کے ساتھ باپ کی اُلفت اور ماں کی لگی ہی نہیں سینکڑوں مریضوں، اپاہجوں کی دعائیں تھیں۔ بچّہ عارف کا بیمار تھا اور مسجد میں سجدے محلہ والوں کے۔ دَم بہ نشترن کے بَن رہی تھی اور صحت کی التجائیں رانڈوں اور یتیموں کی تھیں۔ تندرستی کے بعد ایک یا دو۔ دو چار نہیں بیسیوں بڑھیاں ٹھڑیاں اور کیسی؛ کھو نسڑا جوتی لیری دوپٹہ آرہی ہیں اور کہہ رہی ہیں کہ بیوی اللہ تیری ممتا ٹھنڈی رکھے ساری ساری رات دُعائیں مانگی ہیں نشترن سُن رہی ہے اور شکریہ ادا کر رہی ہے۔ البتہ وسیم دُلہن کو مُبارک باد تو کیا اظہار مسرّت بھی کرنا نصیب نہ ہوا۔ ورنہ چھوٹے سے بڑے تک کُنبہ برادری محلہ پڑوس سب ہی خوش تھے۔ بظاہر بچّہ کی صحت کم دعاؤں کی

کثرت زیادہ اور وسیم دلہن کی خاموشی اور بھی زیادہ تعجب انگیز ہے۔ اولاد والی مامتا سے اچھی طرح واقف اور واقف کیسی وہ بدنصیب ماں جو ایک زندہ شیر سونیا ڈاہ کی قبر میں ہمیشہ کی نیند سلا چکی۔ لیکن اللہ رے سنگدلی ٹس سے مَس نہ ہوئی۔ انگاروں پر لوٹ رہی تھی کہ میرا بچہ اچھا بچھا کالے پانی پہنچے اور اس کا مُردہ زندہ ہو جائے۔ لیکن تینوں تعجب پہلا دوسرا تیسرا حالات کے اعتبار سے بے وقعت ہو جاتے ہیں۔ نسترن خدا کے بندوں کے ساتھ تھی۔ بندوں کا خدا اُس کے ساتھ تھا۔ اُس کی محبت اور خلوص نے جو دل فتح کر لیے۔ آج اُن سب سے اس واسطے دُعائیں نکل رہی تھیں۔ رہی وسیم دُلہن وہ اس طبیعت اور طینت کی عورت نہ ہوتی تو یہ دن ہی کیوں دیکھتی۔ یہ صحیح سوتیا ڈاہ کی آگ نے جگر بھون اور کلیجہ جُھلس دیا تھا لیکن سوکن تو نسترن تھی بے گناہ اور معصوم بچّوں نے کیا بگاڑا تھا کہ اُن کی بھی دشمن بنی۔

اسلام کی مفارقتِ ابدی نے جو زخم وسیم دُلہن کے کلیجہ میں ڈالا نسترن کی کامیابی اُس زخم میں کچو کے تھے۔ اوّل تو بچہ ہی کا خیال کسی وقت پیچھا نہ چھوڑتا تھا اور گھڑی آدھ گھڑی کو علیحدہ بھی ہوتی تھی تو نسترن کا اطمینان وہ بلائے بے درماں تھا کہ کسی کروٹ اور پہلو چین ہی نہ دیتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ تعلیم یافتہ خواتین زیور کی مخالفت زور شور سے کر رہی تھیں اور نوبت یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ زیور کا استعمال ایک قسم کا عیب سمجھا جاتا تھا لیکن حقیقت میں یہ خیال اُس کوتے کی تقلید تھی جو ہنس کی چال چلا اور جس کا منشا یہ تھا کہ شوہر کے بعد جو ہزار دو ہزار روپیہ زیور کی صورت میں بچ رہتا تھا۔ بیوہ عورتیں اس سے محروم ہو جائیں۔

لیکن نسترن اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھی۔ جڑاؤ گلوبند اُس کے پاس

ایک چھوڑ دو دو موجود تھے مگر پھر بھی اس کا یہ مقولہ تھا کہ "زیور ربچے کا سنگھار اور بھوکے کا ادھار ہے۔ عید کے سمے عارف کسی ضرورت سے جوہری کی دوکان پر گیا تو گلو بند اور کنگن ایسے دیکھے کہ پھڑک گیا۔ دونوں کا مول کر گھر لایا اور نسترن کو دیئے۔ گو گھر کا تمام انتظام کھانا پینا وغیرہ سب نسترن کے اہتمام سے تھا مگر وہ ہمیشہ اس بات کی احتیاط کرتی تھی کہ جو حقوق وسیم دلہن کو شرع اسلام نے عطا کیے وہ زائل نہ ہونے پائیں۔ قیمت دونوں کی قریب قریب برابر تھی۔ اُس نے گلوبند خود پہنا اور کنگن شوہر کو دے کر کہا "یہ بسم اللہ کر کے دُلہن بیوی کو پہنا دیجیے۔"

نسترن کی اس احتیاط کو شروع میں تو عارف نے پسند نہ کیا مگر جب اُسے یقین ہو گیا کہ یہ نا پسندیدگی فضول تو خود بھی اس رستہ پر پڑ گیا۔ وسیم دُلہن کے زیور کا بڑا حصہ اُلفتوں کی نذر ہو چکا تھا اور اب اس کو زیور کی پرواہ نہ تھی مگر نہ معلوم کیا نیکی کے دم میں تھی کہ ڈبیا لے لی اور خاموش ہو گئی۔ عارف چلا گیا تو ڈبیہ کھولی، کنگن نکالے تو ایک پر سونے سے یہ حرف کندہ تھے۔

" زن بن بدزن (بدظن، نہ بن۔" دیکھا پڑھا اور رکھ دیا۔

یہ توقع کہ وسیم دلہن کنگنوں سے خوش ہو جاتی جائز نہیں اسلام کا فراق نسترن کی ترقی یہ دو مرض ایسے پیچھے لگے تھے کہ نیند کے چند گھنٹوں میں شاید دماغ چھٹکارا پا جاتا ہو۔ ورنہ ہر لمحہ ایک سے ایک زیادہ سر پہ سوار تھا۔ بدبخت دُھن بھی پرلے سرے کی تھی۔ اِس موقعہ پر آنے جانے والیاں برابر کی بیٹھنے والیاں خوب ہاتھ رنگ رہی تھیں۔ دل سے جوڑ کر ہاں میں ہاں کرتیں۔ باتیں ملاتیں اور کام بناتیں۔ جائداد کا کرایہ بچوں کی امانت تھا اُسی کے ہاتھوں میں آتا اور خوشامدیوں کی بھینٹ چڑھتا، کچھ اپنے وہم کی وجہ سے کچھ سہیلیوں کی کوشش

سے یہ تو اُسے یقین تھا کہ اسلام کو سزا صرف عارف اور نسترن کے سبب سے ہوئی۔ اِن دونوں نے میرے بے گناہ بچہ کو مجھ سے چھٹوا دیا اور یقین کے ساتھ ہی وہ ہمیشہ اس کوشش میں مصروف رہتی کہ بدلا لوں پورا لوں۔ اور ایسا کہ دونوں میاں بیوی کلیجہ مسوس کر رہ جائیں، یہ خبط کچھ ایسا ہاتھ دھو کر پیچھے پڑا کہ عارف اور نسترن کے ہر کام میں اُس کو اُسی کی جھلک نظر آتی۔ عارف نے کوئی بات کی اور اُس نے سوچا کہ میرا ذکر ہے۔ ایک سوکن موجود تھی مگر وہم یہی تھا، کہ دوسری آئی۔

خدا بھلا کرے انیو غیبوں کا کہ ایک ادھر سے آئی اور کہہ دیا۔ "میاں اسلام کا خط آیا ہے۔ اُسی دررزن کو سنا رہے ہیں" دوسری اُدھر سے آئی، اور کہا "جوڑے اور چڑھاوے کا حساب کر رہے تھے۔ اور نکاح کرتے ہیں" تیسری کچھ اور چوتھی کچھ غرض وہم کا ٹھکانا اور بدگمانی کی حد نہ تھی۔ بدنصیب کو میاں کی محبت بھی عداوت دکھائی دیتی تھی اور چاہتی تھی کہ میری طرح عارف اور نسترن دونوں مصیبت کا شکار ہوں۔ نسترن کے اصرار سے کبھی اور خدا کے خوف سے کبھی عارف ایک وقت کا کھانا اکثر وسیم دلہن کے کمرہ میں کھاتا۔ مگر کمرہ کی یہ کیفیت کہ بازار اس سے بہتر تھا۔ ایک پھوہڑ عورت کے گھر میں جو جو کچھ ہونا چاہیے سب موجود تھا۔ دری خاک میں اٹی ہوئی اور پھاڑنی چکنوں سے لپی ہوئی بیٹھنے کی جگہ نہ لیٹنے کا مقام۔ غریب نے اگر بھولے سے پانی منگا لیا تو گلاس کس کا اور صراحی کیسی اور بیوی پانی بلاوے تو کیوں۔ وسیم نے کٹیا کی صورت مٹکے میں آبخورہ ڈبو کر حوالہ کیا اور چلتا ہوا۔ برخلاف اس کے نسترن کا کمرہ عارف کے اجلاس کو مات کرتا تھا۔ جہاں سے اُٹھنے کو آدمی کا جی نہ چاہے۔ عارف کو آرام کرنے کے واسطے نسترن کی صورت ہی نہیں اُس کا سلیقہ اور خدمت بھی

تھی ۔ وسیم دُلہن کمبخت کی تو کچھ ایسی منت پلٹی تھی کہ دن رات اِسی کوشش میں غرق اور سلتوائی میں غرقاب تھی کسی بات کا فکر نہ تھا نہ چیز کا ہوش ۔ زیور کا صندوقچہ کھلا رکھا تھا ۔ سلیم کنگن لے اُڑا ۔ وسیم دُلہن پر اگر مصیبت تھی تو شوہر اس کا ذمہ دار نہ تھا کنگن اُس کے پاس پہنے کو ملکیت ورنہ شوہر کی امانت تھے اُس کے ضائع کرنے کا حق نہ تھا ۔ مگر اُس بیچارے کو خبر بھی نہ ہوئی ۔ محض سرکاری کام کی وجہ سے دو تین دن اور رات اِدھر نہ آسکا کہ ایک نے لگا دیا کہ "کنگنوں کے سبب سے ناخوش ہیں اور گھر سے نکالنے کی فکر میں ہیں ۔ میرے سامنے نسترن کے بھانجے عائشہ کے لڑکے نے کنگنوں کا حال سرکار سے کہا اور میں تو جانوں اُسی نے چُرائے ۔ نہیں تو کہاں سے خبر ہوئی ۔" وسیم دُلہن کی بدگمانی اگر عارف کی ذات تک محدود رہتی تو بھی میاں اپنی تقدیر کو بھوڑتا ۔ بیوی اپنی مگر وہ بدنصیب تو سب گنوں پوری تھی ۔ ہم کو اس کی زندگی میں سب سے زیادہ تعجب انگیز معاملہ یہ ملتا ہے کہ ماں بن کر ماتا رکھ کر صاحب اولاد ہو کر اس آگ کی قدر نہ کی ۔ کائنات کی کوئی دولت اس حالت کی قیمت ادا نہیں کر سکتی جب ایک ماں فرطِ محبت میں اپنے بچّے کو بھینچ بھینچ کر کلیجہ سے چمٹا رہی ہو ۔ اِس کا اندازہ صرف وہی انسانی ہستی کر سکتی ہے جو اس دولت سے مالا مال ہو ۔ فاروق کے خون کا ہر قطرہ یہ حق رکھتا تھا کہ سنگ دل اگر تمام خون بھی قربان کر دیتی تو اطمینان نہ ہوتا ۔ نہ یہ کہ بن ماں اور بن باپ کا بچہ بے وارثا بچّہ حفیظ جس کو نسترن چھ مہینے کی جان مردہ ماں کے سینہ سے اُٹھا کر لائی ، کلیجہ سے لگایا اور اس طرح پالا کہ حقیقی ماں باپ معصوم کے دل سے بھلا دیئے ۔ صرف اتنی خطا یہ کہ خالہ کہہ دیا تھا ایسی سزا پائی کہ آسمان زمین تھرا اُٹھے ۔ یوں تو وہ ہر وقت ہی ایک ایک کو دیکھ کر بھنی جاتی تھی مگر جب سے یہ سُنا تھا کہ اس حفیظ نے کنگن چرائے اور میاں سے

خون کی پیاسی تھی ۔ جانتی تھی نسترن بچوں سے زیادہ بن ماں کے بچوں کی عاشق ہے اُس کے سامنے ہمت نہ پڑی ۔ وہ اتفاق سے کسی شادی میں گئی اور سیلانے بچوں کو گھر میں چھوڑا جس طرح بعض مکار انسانوں کو بلا ضرورت رونا آتا ہے ۔ اسی طرح نالائق عورت خود کشی پر آمادہ ہو جاتی ہے ۔

وسیم دُلہن اتنی باجیا تو تھی نہیں ہاں بچپن کی سُنی سُنائی یہ یاد تھی کہ چوڑیاں اور شیشہ بھی زہر کا کام دیتا ہے ۔ اگر خود کھا کر باپ دادا کی رذالت ثابت کر جاتی اور پردہ ڈھک جاتا تو بھی غنیمت تھا ۔ زہر دینے کا قصد کیا ، اُس بے وارثے معصوم کو جس کے ماں اور باپ دونوں کی قبریں تک برباد ہو چکی تھیں ، تازہ جرم یہ تھا کہ بچہ چونکہ نسترن کو خالہ کہنے کا عادی ہو گیا تھا (گو اب یہ باتیں ختم ہو چکیں لیکن کسی زمانہ میں مسلمان یہ احتیاط کرتے تھے کہ ہمسایہ کو عزیزوں کے برابر سمجھیں) بخار میں ہلہلا وسیم دلہن کے پاس آیا اور کہا ۔

" خالہ جان سر میں درد بہت ہو رہا ہے پٹی باندھ دیجئے ۔ "

یتیم بچہ جس کا والی نہ وارث وسیم دُلہن کو خالہ کہے ! پہلے ہی صورت سے بیزار تھی اُس وقت تو غصہ میں آگ ہو گئی اور کہا ۔

" درزن کے جنے بے ایمان ہم کو خالہ کہتا ہے ۔ "

اتنا کہہ کر ظالم نے معصوم کا کان پکڑ کر مروڑا اور اندر کوٹھری میں لے چلی بچہ کی زبان خاموش تھی مگر جس وقت اُس نے کانپتی ہوئی آنکھیں اِس جفاکار کے چہرہ پر ڈالی ہیں کہ طاقتور ہاتھ کیا کرنے والے ہیں ، اُس کا دل ہی نہیں اُس کا جسم لرز لرز کر با آواز بلند کہہ رہا تھا کہ ۔

" با اختیار بی بی بے اختیار بچہ پر رحم کر ۔ "

قصائی بھولی گائے کو اندر لے گئی ۔ سامنے کھڑا کیا اور جو یتیم دل اِس توقع

پر حاضر ہوا تھا کہ سخت درد میں پٹی بندھوائے اُس نے اپنے جسم پر ہنٹر اسٹریبڈون کی آواز سُنی۔ بلک گیا۔ تڑپ اُٹھا۔ ہاتھ جوڑے، قدموں میں گیا مگر سزا اُس وقت تک ختم نہ ہوئی جب تک بچہ یہ کہتا ہوا بے ہوش ہو کر نہ گرا "خطا معاف کیجیے"؟ کمرہ اندر سے بند تھا اور دُنیا کی کوئی طاقت ایسی نہ تھی کہ کمزور نسیم کو طاقتور وسیم دلہن سے چھُڑا دے۔ وہ ہاتھ جس نے وسیم دُلہن جیسی سینکڑوں مسنڈیاں زمین پر رگڑ دیں۔ بچہ کی مدد کو آگے بڑھا اور ایک سیاہ سانپ کی پھنکار کمزور اور طاقتور دونوں کے کان میں آئی۔ بچہ کی ہر التجا بی بی معاف کر دو! بیگم اب نہیں" بے کار تھی۔ وسیم دلہن سانپ کو دیکھ کر ڈری، ہاتھ روکا، کُنڈی کھولی سانپ قریب آگیا تھا۔ چاہتی تھی کہ بھاگے مگر سانپ نے پاؤں میں پھن مارا اور وسیم دلہن بھی "ہائے مرگئی" کہہ کر گر گئی۔

(۱۲)

شعبان کی چودہ تاریخ کو غروب آفتاب کے بعد جب مسلمان ماؤں کے دیئے ہوئے پیسوں سے بچے دھڑا دھڑ آتشبازی چھوڑ رہے تھے سب سے پہلے فرشتوں نے اُن عورتوں پر لعنت کے نعرے بلند کئے۔ اس کے بعد آناً فاناً جنت آراستہ کردی گئی۔ آج جنتیوں کی عید تھی۔ کامیاب روحیں نہال نہال پھر رہی تھیں۔ اور نورِ الٰہی کی تجلی کی منتظر تھیں۔ نسیمہ بھی دوسری روحوں کے ساتھ ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی کہ اس کی نظر ایک ایسے محل پر پڑی جہاں ایک حسین لڑکی طلائی مسہری پر بیٹھی تھی۔ حوریں اور فرشتے پہلو میں حاضر تھے۔ دودھ اور شہد کی نہریں اُس کے سامنے لہریں لے رہی تھیں اور اُس کی بہار قصر نسیمہ کو مات کر رہی تھی۔ نسیمہ اشتیاق کے قدموں سے آگے بڑھی اور اندر داخل ہو کر سلام کیا۔ جنتی بیوی نے دیکھ کر

نسیمہ حیران تھی کہ آخر اس بیوی کے اعمال کیسے ہوں گے کہ اس کا درجہ سب سے فائق ہے۔ لڑکی مسکرائی اور کہا۔

"تعجب نہ کیجئے۔ مسلمان پیدا ہوئی۔ مسلمان رہی مسلمان مری جنت ماں باپ کے قدموں کے نیچے سمجھی۔ شوہر کو خدائے مجازی جانا، دنیا کو الخلق عیال اللہ خیال کیا یہ تین باتیں تھیں جنہوں نے اِس درجہ کو پہنچایا کیسی تسبیح اور کدھر کے نوافل صرف فرض کی ادائیگی نے یہ رُتبہ دیا۔ دُنیا ایسی گذری تھی۔ گہنا پاتا کپڑا نوکر چاکر کوٹھی بنگلہ سب ہی موجود تھا۔ ماں باپ غریب تو نہیں مگر متوسط الحیثیت تھے ہم دو بہن بھائی تھے۔ ابا جان کے بعد اماں جان نے جس مصیبت اور دقت سے بچہ کو جوان کیا اُن ہی کا دل جانتا ہو گا۔ ایک دو نہیں تین تین چار چار وقت کے فاقے کئے۔ اور شوہر کی عزت میں فرق نہ آنے دیا۔ گھر میں چکٹ چادر لپیٹ کر بیٹھی اور بچہ کو دولہا بنا کر باہر نکالا۔ صاحب ثروت بھائی اور کھاتی پیتی بہن موجود تھی۔ مگر اللہ رے غیرت مٹھی بھر چنوں میں دو دو وقت تیر کئے لیکن شوہر کے نام کو بٹہ نہ لگنے دیا۔ زندہ دُنیا ایسی بیویوں کی مثال کم پیش کرے گی۔ ابا جان کے چار سو روپیہ ماموں جان کے حساب میں تھے مگر اُنھوں نے نہ دیئے۔ ابا جان کے بعد عید کے روز جب اماں جان دس گھونٹے کی بھوکی پیاسی بچہ کو پاس لئے بیٹھی، ماموں جان آئے۔ اللہ غنی! کس شان کی عورت تھیں۔ کمرے میں گئیں کپڑے بدلے باہر آئیں۔ کیا مجال جو لباس سے، چہرہ سے گھر سے تکلیف کا پتہ لگ جائے۔ ماموں جان نے روپیوں کی پوٹلی دی اور کہا "یہ تمہارے میاں کے چار سو روپے ہیں۔ اتنا سُنتے ہی اُن کی آنکھوں میں آنسو آگئے اور روکر کہا" روپیہ آپ کو مبارک جس کی ملکیت تھی جب وہی محروم چلا گیا۔ تو اب میں لے کر اُس کی روح کو صدمہ نہ پہنچاؤں گی۔ آپ خاطر جمع رکھئے مرنے والا اتنا چھوڑ گیا ہے کہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کی ضرورت نہیں۔

اُن کی زندگی کا تمام سہارا اور دُنیا کی تمام اُمیدیں میرا چھوٹا بھائی تھا
آدھی رات تک گوٹہ بُن کر مدرسہ کی فیس ادا کی۔ ایک مشک اور چار آنے کے
آٹے میں آٹھ دن بسر کیے اور اُس کو بی اے تک پہنچایا۔

امتحان والے روز جس وقت انہوں نے چٹنی اور روٹی لاکر رکھی۔
رو رو کر کہا "بیٹا بدنصیب ماں کے پاس اس کے سوا کچھ نہیں" تو میرے بھی آنسو
نکل پڑے جس روز امتحان کا نتیجہ آیا اور انہوں نے آکر کامیابی کی خبر سُنائی تو
اماں جان گلے سے لگا کر اس قدر روئیں کہ ہچکی بندھ گئی۔ اُن کے ہاتھ بچے
کے گلے میں تھے۔ اور نگاہ آسمان پر رو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ

"تونے اپنی قدرت کے کرشمے دکھا دیئے میں اس لائق کہاں"۔

اسی حالت میں لشتم پشتم انہوں نے بھائی کا گھر بسا دیا۔ خدا کی عنایت کہ
اُسی سال دو سو روپے کے نوکر ہو گئے۔ مگر ابھی مہینہ پورا نہ ہوا تھا کہ طاعون
میں گرفتار ہوئے۔ میں اماں جان کا کیا حال بیان کروں، کلیجہ پر گھونسے مارتی
تھیں، دیواروں سے سر پھوڑتی تھیں اور کہتی تھیں "ہائے جوان شبیرا بڑھیا
ماں پر رحم کر" تیسری رات تھی اور گھر میں ہم تین کے سوا کوئی نہ تھا کہ اماں
جان بیمار اور بے ہوش بچہ سے لپٹیں اور خدا سے التجا کی کہ اس کی موت نہ دیکھوں
روتی تھیں، بلبلاتی تھیں، چیختی تھیں، کلیجہ پر گھونسے مارتی تھیں دیواروں
سے سر پھوڑتی تھیں۔ اُس وقت بھائی جان نے آنکھ کھولی۔ اماں جان کو اپنے
پاس بُلایا اور آہستہ سے کہا۔

"قربان ہو جاؤں اس صورت پر اے اماں صبر کرو"۔

اماں جان نے ایک چیخ ماری اور اُن کی چیخ کے ساتھ کلیجہ کا ٹکڑا ہمیشہ کے
لئے جُدا ہو گیا۔ اس واقعہ کے پانچ سال بعد جب میں اماں جان کے مرض الموت

میں اُن سے ملنے کو گئی تو آدھی رات کے وقت جب اُن کا سر میری گود میں تھا؛ اُنھوں نے میری طرف دیکھا اور گڑگڑا کر کہا۔

ایک درخواست کرتی ہوں، رانڈ بھاوج آنکھوں سے اندھی اور معصوم بھتیجا بن باپ کا بچّہ ہے اگر اجازت دو یہ مکان ان کو دے دیدوں۔"

میں اماں جان کے قدموں میں گر پڑی اور عرض کیا "آپ کا مال ہے آپ مالک ہیں۔ میں لونڈی ہوں۔ میں نے حصّہ معاف کیا۔"

اُس وقت ان کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے اور اُنھوں نے صرف اتنا کہا "جس طرح اس آخر وقت میں تم نے مجھے خوش کیا ہے خدا تم کو دین اور دُنیا دونوں میں خوش رکھے۔

یہ میری کامیابی کی ایک وجہ ہے۔

دوسری یہ کہ گو میرا شوہر ایک متمول رئیس تھا اور ڈیڑھ دو ہزار روپیہ کی آمدنی مگر اس قدر فضول خرچ کہ دو کیا اگر دس ہزار ہوں تو صبح سے شام تک برابر کر دے۔ کچھ وقت کا تقاضا تھا۔ کچھ صحبت کا اثر کہ اس کی طبیعت میں آوارگی پیدا ہوئی اور روپیہ برباد کرنا شروع کیا۔ ایک تین سال کے عرصہ میں تمام علاقہ اور جائداد ختم ہوئی۔ روپیہ پاس نہیں رہا، ضرورتیں رہیں بدستور زیور بکنا شروع ہوا اور اس لئے کہ میں منع کرتی تھی مجھے میکہ پہنچا دیا۔ مگر اُس وقت جب کان میں چاندی کی بالی اور اُنگلی میں تانبے کی انگوٹھی تک نہ رہی۔ چند روز میں وہ یار دوست بھی ایک ایک کر کے کھسکنے شروع ہوئے اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ دانت کریدنے کو تنکا تک نہ رہا اور اس کے ساتھ ہی ایک ایسا پھوڑا نکلا کہ جان کے لالے پڑ گئے۔ مجھ کو جس وقت یہ خبر پہنچی ہے کہ حالت یہ ہے کہ شاید آٹھ دس روز اور زندہ رہیں۔ تو میری آنکھوں میں دُنیا

اندھیر ہوگئی۔ ہزار روپیہ میرے پاس اُن کی کمائی کا محفوظ تھا میں بے تابانہ اُن کے پاس پہنچی تو کیا دیکھتی ہوں کہ میلے چکٹ کپڑے۔ کھرّی چارپائی پر اکیلے پڑے ہیں۔ بخار زور شور کا ہے اور کروٹ تک نہیں لی جاتی۔ میری صورت دیکھ کر آنکھوں میں آنسوں آگئے۔ اور ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے۔ "میرا قصور معاف کرو، آخر وقت ہے تم سے سخت نادم ہوں۔"

میں نے وہ ہاتھ سر پہ رکھے اور کہا "تم آقا اور مالک ہو مجھے گنہگار نہ کرو۔" یہ سُن کر اُن کی طبیعت اور بھر آئی اور کہا "ایک ایک پیسہ کی دوا کو ترس رہا ہوں یہ مُنہ اس قابل نہیں کہ تم کو دکھاؤں۔"

میں اُن کے قدموں میں گر پڑی۔ رو رہی تھی کہ اتنے میں چند آدمیوں کا غُل غپاڑہ ہوا اور معلوم ہوا پانسو روپیہ کے قرضہ میں گرفتاری ہوگی۔ وہ اُس وقت بید کی طرح کانپنے لگے۔ میری طرف دیکھا اور کہا۔

"بیگم اب کیا کروں۔"

میں نے وہ روپے اُن کے آگے ڈال دیئے اور کہا "گھبراؤ نہیں تمہاری کمائی میں سے ہزار روپیہ محفوظ ہے۔ قربان کیا تھا یہ روپیہ۔"

اُنھوں نے میری طرف دیکھا اور اُچھل پڑے ہاتھ میرے سر پہ رکھا اور کہا . . "شوہر نہیں غلام ہوں۔"

"میں تو اس قابل نہیں مگر خدا اس کا بدلہ تم کو وہاں دے گا۔"

ان کی دُعا قبول ہوئی، اور یہ اُن دونوں کی دُعاؤں کا نتیجہ ہے کہ میں اس درجہ کو پہنچی۔

(۱۴۳)

اُدھر یہ گذری۔ اِدھر سلیم شیشہ اور کانچ ملا دودھ کا پیالہ جو وسیم دُلہن

نے حفیظ کے واسطے رکھا تھا، منہ سے لگا غٹ غٹ پی گیا۔ اور تھوڑی دیر بعد کلیجہ کٹنا شروع ہوا۔ پہلی ہی اُبکائی میں آنکھیں پتھرا گئیں اور بیچ انگنائی میں بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

یہ وہ وقت تھا کہ ایک گھر میں تین بے ہوش پڑے تھے۔ بخار زدہ حفیظ وسیم دُلہن اور اُس کا بچہ سلیم۔ حفیظ کا چوٹ سے سلیم کا زہر سے اور وسیم دلہن کا سانپ سے تینوں کا جسم نیلا چوڑی تھا سب سے پہلے بیمار معصوم کی آنکھ کھلی۔ مگر وسیم دُلہن کی ہیبت دل پر اس قدر چھا گئی تھی کہ اس کو برابر لیٹا دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے بعد وسیم دُلہن ہوشیار ہوئی تو نمازِ عشا کے بعد نسترن کی دُعا اُس کے کان میں آئی۔

" مولا کس کی طاقت ؟ ایک خاک کا پُتلا انسان، آقا کس کی ہمت ایک احسان فراموش، بے ایمان۔ تیری ابدی طاقت اور ازلی حکومت کے آگے فرنٹ ہو۔ دین و دنیا کے مالک! تیرے ادنیٰ عتاب سے، زمین و آسمان کے بادشاہ۔ تیرے معمولی عذاب سے شاہوں نے بھیک مانگی۔ سلطنتیں تاراج ہوئیں حاکم حقیقی! وہ عقل دیوانی وہ دماغ خبطی جو اپنی طاقت پر پھولے، جو اپنی حالت پر اینٹھے۔ شہنشاہِ دوجہاں وہ طاقت فانی، وہ حالت ناپائیدار، مستقل طاقت ابدی حکومت ارحم الراحمین تیری تیری تیری۔

ایک گنہگار ہستی کو، ایک نابکار عورت کو، ایک انسان فانی کو ایک نافرمان مغلانی کو یہ درجہ، یہ رتبہ، یہ عزت، یہ دولت، آزار سے دُور افکار سے الگ۔ گھر بار کی مالک تحصیلدار کی بیوی، قربان ہو جاؤں، صدقے ہو جاؤں نثار ہو جاؤں، فدا ہوں، میرے مولا تیری عنایت کے تیرے رحم کے، تیری شفقت کے تیرے کرم کے۔"

نافرمان ہوں ماں باپ کی، احسان فراموش شوہر کی، گنہگار ہوں، تیری مگر آقا لرزتی ہوں، مولا کانپتی ہوں۔ تیرے عذاب سے تیرے عتاب سے۔

ابھی نسترن دعا میں مصروف تھی کہ "ہائے ہائے" کی آواز کان میں آئی گھبرا کر اٹھی کہ یہ منظر دیکھا وسیم دلہن کا بدن ایک پھوڑا تھا جس میں سر سے پاؤں تک پیپ اور لہو بھرا ہوا تھا چپکیں اور ٹیسیں اس غضب کی تھیں کہ ایک چیخ آسمان تھی اور ایک زمین تکلیف اس قیامت کی تھی کہ خدا دشمن کو بھی نہ دکھائے۔ ہاتھ پاؤں دے دے پٹختی تھی۔ مگر کھولن کسی طرح کم نہ ہوتی تھی۔ وسیم دلہن کے برابر میں دیکھا تو حفیظ پڑا تھا پنڈے پر ہاتھ رکھا تو پھلس رہا تھا۔ روشنی میں دیکھا تو نیلا کانچ، پوچھا: "بیٹا یہ کیا ہوا۔؟"

نسترن کے پکارنے سے بچہ بلبلا اٹھا دوڑ کر لپٹا اور کہا۔

"اچھی خالہ جان بچالو، نہیں بھول گیا بیگم صاحب بچائیے۔"

نسترن:۔ بیگم صاحب کیسی ہیں تمہاری خالہ ہوں۔"

حفیظ نہیں بیوی جی نہیں۔ اب نہیں کہوں گا۔"

اتنا کہہ کر بچہ ہاتھ جوڑ نسترن کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اور کہنے لگا۔

"بیوی جی اب نہیں کہوں گا۔ بھول گیا تھا۔"

نسترن نے چمکار کر گود میں لیا اور کہا: "یہ مارا کس نے ہے ارے کیا ہوا۔؟"

حفیظ اس کا جواب نہ دیتا تھا۔ گود میں اٹھا کر اپنے ہاں لائی۔ اس کے چوٹ کاری لگی تھی اور ایسا سہما ہوا تھا کہ ایک ایک سے کہتا تھا "خدا کے لئے بچاؤ اب نہ کہوں گا۔"

وسیم دلہن کی تکلیف لمحہ بہ لمحہ بڑھ رہی تھی ایک آگ تھی کہ سر سے پاؤں تک لگ رہی تھی۔ تمام جسم پھنکا جاتا تھا۔ اسی حال میں بچہ کا خیال آیا اور "ہائے اسلام" کی چیخیں مارنے لگی۔ اسی حالت میں نظر سلیم پر پڑی کہ قے کے ساتھ انتڑیاں اور کلیجہ کٹ کٹ کر باہر آرہے ہے۔ ماں بیٹوں کی نظریں چار ہوئیں۔ دونوں کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ سلیم نے صرف اتنا کہا "اماں جان دودھ میں کیا زہر تھا۔" اور پھر بے ہوش ہو گیا۔

"ہائے تو نے پی لیا۔" اُٹھی اور ایک چیخ ماری اور یہ کہہ کر سلیم پر گر پڑی۔

"اپنے ہاتھ سے زہر دینے والی ماں قربان! آنکھ تو کھول۔"

(۱۴)

رات کے دو بجے ہوں گے کہ عائشہ کے ساڑھے چار سال کے بعد اس یتیم بچہ پر سکرات کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ نسترن اس کے سرہانے تھی۔ بچہ بے ہوش تھا۔ دفعتاً چلّایا اور یہ کہہ کر "اب کوئی بچا د آپ نہیں کہوں گا۔" بے ہوش ہو گیا۔ اس دفعہ نسترن کو یقین ہوا کہ بن ماں کا بچہ میرے پاس خدا کی امانت تھا۔ جب تک میں نے محبت سے پالا میرے پاس رہا اب مجھ سے کوئی غلطی ہوئی اس لئے خدا اپنی امانت واپس لیتا ہے اس یقین کے ساتھ ہی وہ اس کی طرف جھکی اور کہا "حفیظ میاں خدمت گذار خالہ سے خفا ہو کر اس گھر سے رخصت ہوتے ہو۔ بید کی بدھیاں بخار زدہ جسم پر نہیں بدنصیب خالہ کے کلیجہ پر ہیں۔"

اتنے ہی میں برابر سے رونے کی آواز آئی۔ عارف کو ادھر بٹھا

ادھر گئی تو وسیم دلہن ایک ایک کے آگے ہاتھ جوڑ رہی تھی کہ "للہ میرے جسم پر پانی ڈولے جاؤ۔ جوان شبیر اُس کے سامنے دم توڑ رہا تھا۔ کلیجہ پر گھونسے مارتی تھی۔ دیواروں سے سر پھوڑتی تھی اور چلاتی تھی "ارے رحم کرو سلیم کو بچاؤ۔ اس آگ کو بجھاؤ"

نسترن پاس کھڑی رو رہی تھی۔ وسیم دلہن نے اس کی طرف دیکھا اور کہا۔

"اپنے بچوں کا صدقہ رحم کرو"

اتنا سنتے ہی نسترن بے تاب ہو گئی اور رو کر کہا۔

"آپ بیگم ہیں میں لونڈی ہوں، میری جان بھی کام آئے تو عذر نہیں۔ میں نے ڈاکٹر کو بلوایا ہے۔ آپ صبر کیجیے آتا ہو گا"

اتنے میں ڈاکٹر بھی آ گیا۔ سلیم کو قے کی اور وسیم دلہن کو نیند کی دوا دی۔ سلیم متواتر قے کر رہا تھا اور جیتے خون کے تھتلے کے تھتلے نکل رہے تھے۔ وسیم دلہن کی اذیت دیکھی نہ جاتی تھی۔ جسم سوج کر کپّا ہو گیا اور کچھ ایسا زہریلا مواد بھر گیا تھا کہ چیچکوں اور ٹیسوں نے جان پر بنا دی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ آگ میں بھُن رہی تھی۔ اِدھر اپنی مصیبت، اُدھر اسلام کا خیال اور سامنے ایک لال کا دمِ واپسیں۔ ایک ایک کے آگے حسرت سے دیکھتی، منت سے ہاتھ جوڑتی اور کہتی تھی۔

"ارے للہ بچاؤ۔"

خدا خدا کر کے ذرا آنکھ لگی تو کیا دیکھتی ہے کہ بارہ سال کا بچھڑا ہوا وسیم جس نے آخر وقت بیوی کے چہرے پر وداعی نظر ڈال کر درخواست کی تھی کہ یتیم بچے تمہارے سپرد ہیں۔ ان کی تربیت میں غفلت نہ کرنا؟

سامنے کھڑا ہے۔ ایک ہاتھ میں کشتی خوان پوش سے ڈھکی ہے اور دوسرے ہاتھ میں چھری۔ برابر میں سلیم تڑپ رہا ہے اور باپ سے کہہ رہا ہے کہ۔
"ابا جان اماجان نے مجھے دودھ میں زہر دیا۔ وسیم جیسا کڑیل جوان جس کی پیشانی پر مرض الموت میں بھی بل نہ آیا۔ اِس وقت زار و قطار رو رہا ہے۔ وسیم ڈُلہن سناٹے میں رہ گئی۔ بھاگنا چاہتی تھی کہ وسیم نے کہا :۔
" ایک عورت کے ماں بننے کا انجام اور بیوی ہونے کا نتیجہ جو کچھ تجھ کم بخت کی ہستی سے برآمد ہوا۔ میں یا میرے ماں باپ نہیں تیرے باپ دادا اور پر دادا کی روحیں اس سے تھر تھرا رہی ہیں۔ ضرورت ہے کہ اِس وقت اپنی پچھلی زندگی پر نظر ڈال، بیٹی تھی تو کیسی تھی، بیوی ہوئی اور ماں رہی تو کیسی رہی۔ بھول مت۔ وہ رات جب عاشق زار ماں کو صرف اس قصور میں کہ کھڑا ہونے کو منع کیا تھا، کامل آدھ گھنٹہ تونے باتیں سُنائیں وہ رات گُذر گئی وہ گھڑی نہ رہی، مگر تیرا سلوک، تیرے اعمال نامے میں موجود ہے۔ ماں مرگئی تو مر رہی ہے، لیکن وہ ٹھیس جو ممتا کی ماری کے سینۂ دل کو تیری تیز زبان سے پہنچی ابھی زندہ اور محفوظ ہے۔ فراموش نہ کر وہ دن جب شوہر جو خدائے مجازی تھا، بھوکا لق و دق کرتا کچہری چلا گیا اور تو کمزوری کا بہانہ کئے پلنگ پر پڑی رہی۔ اُس کی بھوک اور تیرا مکر دونوں ختم ہو چکے، لیکن مادرِ دنیا کا ہر بچہ۔ بچہ کا ہر سانس، سانس کا ہر عمل بے کار نہیں با کار، خالی نہیں کچھ معنی رکھتا ہے۔ وقت گذرنے والا، کام رہنے والا، بات ہو چکنے والی، لیکن اثر رہ جانے والا ہے۔ عارف آج بھوکا نہ ہو، لیکن اُس کی بھوک، تیرے اعمال نامے میں باقی رہے گی "
عائشہ کا بچہ بِن ماں کا بِن باپ کا، چار سال کا جس کے آنسو کا ہر

قطرہ فرشتوں کا دل دہلا دینے والا، جس کے دل کی ہر آہ عرش کا کنگورا ہلا دینے والی تجھ سے مدد مانگے۔ الٹا کہے کہ سر میں پٹی باندھ دو اور صرف خالہ کہنے پر وہ سنگین مار کھائے کہ در و دیوار تک کانپیں اور تیرا دل نہ پسیجے!

کس برتے پر اے جفاکار، کس بھروسہ پر اس جسم پر گھمنڈ اور طاقت پر بھروسہ تھا؟ تو نے سادات کی آبرو پر پانی پھیرا۔ باپ دادا کی عزت خاک میں ملائی آنکھ اٹھا کر اوپر دیکھ، آسمان سے زمین تک کائنات کا ہر ذرہ تجھ پر لعنت بھیج رہا ہے اور نسترن جس کو سوکن سمجھا اور دزن جانا ادھر نظر ڈال محلہ کا ہر انسان اور آسمان کی ہر مخلوق اس کا کلمہ پڑھ رہی ہے اپاہج اُس کے در سے اور رانڈیں اُس کے گھر سے پل اور جی رہے ہیں۔ اس کی جان اور مال کی، اُس کے شوہر اور بچوں کی حفاظت وہ یتیم کر رہے ہیں جو ادھر دسترخوان سے پیٹ بھرتے ہیں اور ادھر خدا کی سلطنت کے مالک ہیں:۔

میرے دونوں کلیجہ کے ٹکڑوں اسلام اور سلیم کا حشر جو تجھ ناہنجار ماں کے ہاتھوں ہوا دنیا تیرے پیچھے اور ان کے بعد بھی اُس کو یاد رکھے گی! تو ماؤں کے واسطے سبق، بیویوں کے لئے نمونہ اور عورتوں کے لئے عبرت ہوگی۔؟

سلیم کا زہر تیری غلطی نہیں حفیظ کی آہ، اور تیری اذیت سانپ کا کاٹا نہیں فاروق کی بد دعا ہے۔ لیکن ابھی کچھ نہیں ہوا۔ یہ تمہید ہے اُس عذاب کی جو نازل اور مصیبت کی جو برپا ہونے والی ہے۔

اپنی مصیبت کو رو چکی۔ اب رو اُس لال کو جو۔ تجھ بدبخت ماں کی

بدولت وطن سے ہزاروں کوس دُور پانی کے ایک قطرے کو ترستا دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔

اتنا کہہ کر وسیم نے خوان پوش اُٹھایا اور اسلام کا سر ماں کی گود میں ڈال دیا۔

ایک چیخ ماری۔ ابھی آواز ختم نہ ہوئی تھی کہ وسیم نے سلیم کو گردن پکڑ کر اُٹھایا اور بیوی سے کہا۔

"جن آنکھوں نے بےبس فاروق کا خون ہنس ہنس کر، جس دل نے کمزور حفیظ کی مار کِھل کِھل کر دیکھا اور دیکھی وہ یہ بھی تماشہ دیکھیں۔"

اب وسیم نے بچّہ کو چت لٹایا۔ تیز چھری کی دھار چمکی اور آناً فاناً باپ نے ماں کے سامنے بچّہ کو ذبح کر دیا۔ سلیم کے خون کی چھینٹیں ماں کے کپڑوں پر پہنچیں۔ بلبلائی اور خواب ہی میں بے ہوش ہو گئی۔ یہاں تک کہ عارف کی آواز نے جو لنتن کے سوال کا جواب تھا۔ اس کو ہوشیار کیا۔

"ہاں، ہاں اسلام کی موت کا تار ہے۔"